نقش سویرا

نقشِ سویدا

در تپش ہر ذرّہ از خاکم سویدائے دل است
آنچہ از من رفت ہم بر خویش قسمت می کنم

غالبؔ

نقشِ سویدا

حکیم محمد نبی خاں جمال سویدا

مجلس یادگارِ اجمل

پوسٹ بکس ۲۰۹ ، ریلوے روڈ ، لاہور

طبع اوّل ——— دسمبر ۱۹۷۱ء

تعدادِ اشاعت ——— ایک ہزار

ترتیب ——— رضوی خیرآبادی

خطّاطی ——— محمد صدیق الماس رقم

طابع ——— مکتبہ جدید پریس، لاہور

ناشر ——— مجلسِ یادگارِ اجمل، لاہور

تقسیم کنندگان ——— مکتبہ جدید لاہور

قیمت : بارہ روپے

انتساب

اپنی بیوی

مہر جہاں بیگم کے نام



لاہور، جولائی ۱۹۷۱ء

ترتیب

غزلیں

نظمیں

ہندی غزلیں

تاریخیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِفتتاحیہ

یہ مجموعہ فنّی تخلیق ہے، نہ شعری کارنامہ، یہ جذبات کی کوئی معنی خیز منظوم کہانی بھی نہیں ہے، زیادہ سے زیادہ اسے فراغت کے اوقات کا ایک ذہنی مشغلہ کہا جاسکتا ہے جو آج سے پچاس برس پہلے کے روایتی دیوان خانوں کا سب سے بے ضرر اور شریفانہ مشغلہ تھا۔

زندگی کا شعرِ اوّلیں، چودہ برس کی عمر میں، ایک خط لکھتے ہوئے، دفعتہً وارد ہوا:

میری آنکھوں سے ٹپکی پڑتی ہیں — سُرخیاں اُن گلابی گالوں کی

اور اس کے بعد سے "موزوں گوئی" فرصت کے لمحات کی رفیق و انیس بن گئی۔

مولانا سیّد ظہور احمد وحشؔی شاہجہانپوری ندوۃ العلماء کے فاضل، پختہ قلم ادیب اور خوش گو شاعر تھے۔ عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے اور اچھا شعر کہتے تھے۔ انہیں اپنا رہبر بنایا۔ یہ سلسلہ جاری تو رہا لیکن اس رفتار سے اور اس احتیاط کے ساتھ کہ نو دس برس کی مدّت میں مشکل سے نو دس غزلیں ہی دکھانے کی نوبت آئی ہوگی۔ اس کے بعد وحشؔی صاحب انتقال کر گئے اور یہ برائے نام سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔

اس زمانے کا ایک شعر یہ ہے:

چلی نسیم، کِھلے پھُول، فصلِ گُل آئی — چمن میں بلبلِ شیدا ہے بے قرار ابتک

محترم حکیم حبیب آشعرؔ میرے بچپن کے ساتھی اور برابر کے دوست ہیں۔ میری ان کی عمر میں تو کوئی ایسا فرق نہیں ہے لیکن "دودِ چراغ" کے "تریاکی" ہونے میں وہ مجھ پر سبقت رکھتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی عمرِ عزیز کا بیش تر حصّہ اس شوق کی نذر کیا ہے۔ وحشیؔ صاحب کے انتقال کے بعد میں نے ان سے رجوع کیا، وہ میرے "رہبر" بھی ہیں اور "رفیق" بھی۔ ساتھ ساتھ چلتے ہیں، جہاں قدم اوچھا پڑا انہوں نے ٹوک دیا۔

ان کی استادانہ "رفاقت" کی چند مثالیں ملاحظہ طلب ہیں:

نیازِ عشق میں وہ نازِ بندگی بھی نہیں (نہیں) — جبینِ شوق کے سجدوں میں کچھ کمی بھی نہیں

"میں وہ" کی بجائے "نہیں"

ایک سایہ سا جو دیوار پہ بکھرتا تھا کبھی (منڈلاتا تھا) — زلزلہ بن کے ترے قصر سے گزرا ہوگا

"بکھرتا تھا کبھی" کی بجائے "منڈلاتا تھا"

سویداؔ ذرا زخمِ دل کو تو دیکھو — شفق بڑھ گئی ہے (گھل رہی) فضا میں زیادہ

"بڑھ گئی" کی بجائے "گھل رہی"

رفعتیں (فاصلے) جب ناپنے لگتا ہے ذوقِ جستجو — اپنے سائے سے الگ ہو کر گزر جاتا ہوں میں

"رفعتیں" کی جگہ "فاصلے"

جو رفاقت مجھے مطلوب تھی، مل گئی۔ وقت گزرتا رہا۔ بقولِ میرؔ "دیوان کیا"۔

..کچھ پیاسیں تھیں، سو بجھا لیں۔ شاید اس مجموعے کی اشاعت بھی ایک پیاس ہو!

1.5.71

(حکیم) محمد نبی خان جمالؔ سویدا

حمد

لاریب کہ ذُوالجلالِ برحق بھی ہے تُو
معبُود بھی ہے اور قادرِ مُطلق بھی ہے تُو
جَوہر سے عَرَض الگ ہو، ممکن ہی نہیں
مصدر بھی تُو ہے اور مُشتَق بھی ہے تُو

لاہور، ۱۱ مئی ۱۹۷۱ء

نعت

کعبۂ ایماں، رُخِ نیکوئے دوست　　حلقۂ جاں، حلقۂ گیسوئے دوست
شوق کھینچے ہے مجھے دل کی طرف　　دل یہ کہتا ہے کہ چلیے سُوئے دوست
کونسے غنچوں میں ہے اُس کی ہنسی　　کونسے گُل میں ملے گی بُوئے دوست
یہ تمنّا ہے کہ آنکھیں مُوند کے　　دل کے آئینے میں دیکھوں رُوئے دوست
عِشق کا یہ مرتبہ تو دیکھیے　　شاہ ہوتا ہے گدائے کُوئے دوست

روشنی بھرتا ہے آنکھوں میں جمالؔ
آئنہ کرتا ہے دل کو رُوئے دوست

لاہور، ۶ مئی ۱۹۷۱ء

حُسین علیہ السّلام

رنگِ شفق ہے خونِ شہیداں سے لالہ کار
ہے غازۂ حیات، شہادت حُسینؑ کی
ہر دَور کا وقار ہے آشوبِ کربلا
ہر دل کی آبرُو ہے محبّت حُسینؑ کی

لاہور، ۱۳ مئی ۱۹۷۱ء

○

مَیں دِلّی کے گئے وقتوں کا اِک دُھندلا سا نقشہ ہُوں
مِرے اخلاق میں اسلاف کا جَوہر بھی شامل ہے
مِرے کردار میں اجداد کی تہذیب کا پرَتو
مِرے اُسلوب میں خوش فکریِ اشعر بھی شامل ہے

لاہور، ۳۱؍اگست ۱۹۶۵ء

یادِ حبیب

حکیم حبیب اشعرؔ کی یاد میں

ولادت: یکم جنوری ۱۹۱۹ء

وفات: ۱۵ ؍ جون ۱۹۷۱ء

بلبل چمن سے اُڑ گئی، ویرانہ رہ گیا
مینا شکستہ ہو گئی، پیمانہ رہ گیا
مے کے بغیر نام کا مے خانہ رہ گیا
گُم ہو گئیں حقیقتیں، افسانہ رہ گیا
پہلی سی دل کشی نہیں لیل و نہار میں
جب تم نہیں تو کچھ بھی نہیں روزگار میں

کل تک جو تھا چمن میں کہاں، کس طرف گیا؟
بے نیل، بے مرام، دواں کس طرف گیا؟
آخر ورائے وہم و گماں کس طرف گیا؟
اے باغباں! وہ سروِ رواں کس طرف گیا؟
سایہ بھی جس کے قد کا تجلّی مآب تھا
دیوانِ روزگار کا جو انتخاب تھا

خوشبو تھی جسکے سانس کی گُل برگ و مشک زا
نغموں سے جسکے گونجتی رہتی تھی یہ فضا
لہجے سے جسکے پاتے تھے بیمارِ غم شفا
جس کے قلم کا نقطہ "بیاضِ کبیر" تھا
اے گردشو! وہ قصرِ خرد کار کیا ہُوا؟
کوچہ وہی ہے سایۂ دیوار کیا ہُوا؟

افسردگی نژاد ہے رفتارِ آسماں
آفاتِ روزگار بھی کرتے ہیں سرگراں
ہر چند برخلاف ہے نیرنگیِ جہاں
انساں کو سب گوارا بجز مرگِ ناگہاں

اِس مرگِ ناگہاں کا مداوا کوئی نہیں
ناچار ہے طبیب کہ چارا کوئی نہیں

کوہ و دمن میں تازگی اشعرؔ کے دم سے تھی — صحنِ چمن میں رستگی اشعرؔ کے دم سے تھی
شعر و سخن میں شستگی اشعرؔ کے دم سے تھی — ہر انجمن میں زندگی اشعرؔ کے دم سے تھی

سب رونقیں تھیں اشعرِ شب زندہ دار سے
کچھ اور عمر مانگتے پروردگار سے

جب انجمن سجانے کو احباب آئینگے — عیش و نشاطِ روح کے سامان لائینگے
ویرانۂ حیات کو جنّت بنائینگے — گُل ہونگے ہر طرح کے، وہ خوشبو نہ پائینگے

ڈھونڈے گی ہر طرف تجھے چشمِ وفا پسند
بے اختیار یاد کریں گے نیاز مند

بے برگ و بار دل کو ابھی انتظار ہے — آشفتہ کار دل کو ابھی انتظار ہے
خوش اعتبار دل کو ابھی انتظار ہے — اُمّید وار دل کو ابھی انتظار ہے

اُمید ہے کہ وعدۂ فردا نبھاؤگے
ایسے کہاں گئے ہو کہ واپس نہ آؤگے

پھولوں کی خوشبو مہکے گی تم یاد آؤگے — بلبل چمن میں چہکے گی تم یاد آؤگے
کوئل کی کوک لہکے گی تم یاد آؤگے — یادوں کی آگ دہکے گی تم یاد آؤگے

برسات میں ستائے گی ٹھنڈی ہوا کی چوٹ
پُروا چلے گی، اُبھرے گی برسوں پُرانی چوٹ

۲۰ جون ۱۹۷۱ء، لاہور

غزلیں

○

اسا اس دل بے ثبات کب تک، مجاز عینِ نظر نہیں ہے
گماں پہ بُنیاد رکھ رہا ہوں حقیقتوں کی خبر نہیں ہے

خدا ہی جانے یہ راز کیا ہے کہ اب بھی عزمِ سفر ہے باقی
وہ منزلیں تو گزر چکی ہیں کہ جن کے آگے سفر نہیں ہے

ہزار پردوں میں چھپ کے رہنے سے یہ بتاؤ کہ فائدہ کیا
کسی میں تابِ نظر نہیں ہے یہاں کوئی پردہ در نہیں ہے

گھُٹی گھُٹی سی یہ سرد آہیں، یہ اُترا اُترا اداس چہرہ
یہ تم کو کیا روگ لگ گیا ہے، تمہیں بھی اس کی خبر نہیں ہے

وہی فراق و الم کے ڈیرے، وہی بلائیں، وہی اندھیرے
میں عشق کے جس مقام پر ہوں، نظامِ شمس و قمر نہیں ہے

مکاں تو کیا لامکاں سے آگے نکل گیا شہپرِ تخیُّل
یہ اس بلندی پہ اُڑ رہا ہے جہاں کسی کا گزر نہیں ہے

ہزار سُورج بھی مل کے نکلیں تو تیرگی دل کی کم نہ ہوگی
جسے سمجھتے ہو تم اُجالا وہ شہرِ غم کی سحر نہیں ہے

گزر گئے لاکھ آستانے، جُھکا نہ یہ سر کہیں سویدا
یہ عشق کا مرحلہ عجب ہے، جبیں تو ہے سنگِ در نہیں ہے

۱۹۶۵ء، لاہور

○

تیرے جلوے سے مرے دل کا فروزاں ہونا — ایک ذرّے کا ہے خورشید بداماں ہونا

جب کسی غنچے کا مُنہ چومتی ہے موجِ نسیم — یاد آتا ہے ترے لب کا گلستاں ہونا

جیسے وہ جلوہ بقدرِ طلبِ شوق نہیں — دل کی لغزش پہ نگاہوں کا پشیماں ہونا

کس کو فرصت ہے کہ ہر بُت کا جگر چاک کرے — ورنہ مشکل تو نہ تھا کفر کا ایماں ہونا

اب کہاں جاؤں یہ آشوبِ تمنّا لے کر — درد کو آگیا مضرابِ رگِ جاں ہونا

یہ بھی منجملۂ اندازِ مسیحائی ہے' — میرے غم کا ترے چہرے سے نمایاں ہونا

آپ ہی دیکھنا آئینے میں اپنا جلوہ — آپ ہی اپنی تجلّی سے پریشاں ہونا

سانس لینے کو مسافر کی طرح ٹھہرے تھے — ہائے اس سایۂ دیوار کا زنداں ہونا

غیرتِ جوشِ جنوں کے لیے نشتر ہے جمالؔ!
وحشتِ عشق کا ہم چشمِ غزالاں ہونا

سنہ ۱۹۶۵ء، مدائن

○

شعلۂ دل کی لپیٹ سے جب نکھر جاتا ہُوں میں
رنگ بن کر آپ کے رُخ پر بکھر جاتا ہوں میں

غم گزیدہ جانتا ہے ہر مسرّت کا مآل
وصل کا پیغام آتا ہے تو ڈر جاتا ہوں میں

جب مری رگ رگ میں گھُل جاتا ہے زہرِ آرزو
زندہ رہنے کے لیے کچھ دن کو مر جاتا ہوں میں

دشت ہو یا صحنِ گلشن، اس سے مجھ کو کیا غرض
جس طرف دل کا اشارہ ہو اُدھر جاتا ہوں میں

فاصلے جب ناپنے لگتا ہے ذوقِ جستجو
اپنے سائے سے الگ ہو کر گزر جاتا ہوں میں

گوہرِ فطرت نہ پا کر ساحلِ احساس پر
قلزمِ افکار کی تہ میں اُتر جاتا ہوں میں

قافلے والے نہ جانے کر رہے ہیں کیا گماں
سانس لینے کو یونہی دم بھر ٹھہر جاتا ہوں میں

بُوئے گُل ہُوں، جھولتی ہے مجھ میں بادِ خوش خرام
آگ کا شعلہ ہوں آندھی سے بپھر جاتا ہوں میں

خار ہوں، گُل چیں کی آنکھوں میں کھٹکتا ہوں جمالؔ
پھُول ہوں، ہلکی سی جنبش سے بکھر جاتا ہوں میں

سنہ ۱۹۷۱ء، لاہور

○

عشق منّت کشِ بیاں تو نہیں زخمِ دل ہے کوئی زباں تو نہیں

سوچتا ہُوں، مری جبینِ نیاز آپ کا سنگِ آستاں تو نہیں

"کوئی اپنا نہیں زمانے میں" یہ سخن آپ پر گراں تو نہیں

دامنِ صبر چھُوٹا جاتا ہے غم، محبّت کا امتحاں تو نہیں

مجھ سے مل کر یہ سرگرانی کیوں؟ اہلِ دل ہُوں، وبالِ جاں تو نہیں

جہدِ انساں برائے نام و نمُود دیکھنا، سعیِ رائیگاں تو نہیں

دل لگایا ہے اِک مسیحا سے اِس میں کچھ جان کا زیاں تو نہیں

پھُونک دے اپنی آتشِ دل سے برق، تقدیرِ آشیاں تو نہیں

کتنے روشن ہیں دل کے داغ جمالؔ!

شامِ غم صبحِ گلستاں تو نہیں

سنہ ۱۹۶۲ء، لاہور

○

مِٹ گیا دل مگر آشوبِ تمنّا نہ گیا
دیدۂ شوق گیا، شوقِ تماشا نہ گیا

نکہتِ موسمِ گُل نے جو نمک پاشی کی
زخم یُوں تازہ ہُوا ہاتھ لگایا نہ گیا

تیرا وحشی ترے کُوچے میں جو آنکلا تھا
مدّتوں شہر سے اس بات کا چرچا نہ گیا

کیا ملے گا اُسے دیوارِ حرم کا سایہ
جس سے پتھّر کا کوئی بُت بھی تراشا نہ گیا

کثرتِ شوق بنی غیرتِ ناموسِ وفا
وہ تو گزرے تھے مگر ہم سے پُکارا نہ گیا

شورشِ دل نے ہمیں فکر کی مہلت ہی نہ دی
اور کبھی سوچنا چاہا بھی تو سوچا نہ گیا

سب بھرم کھُل گیا آوازِ شکستِ دل سے
ہم سے اک جامِ تمنّا بھی سنبھالا نہ گیا

تپتے صحرا میں بھی ممکن ہے بہار آجاتی
تیرے کوچے سے کوئی دشت کو رستا نہ گیا

میری تقدیر بھی محرومیٔ نظّارہ جمال!
آج وہ سامنے آئے بھی تو دیکھا نہ گیا

سنہ ۱۹۶۹ء، لاھور

○

جلوۂ حسن جُنوں تاب نظر آیا تھا
دل ہمیں پارۂ سیماب نظر آیا تھا

اپنی ہستی ہی میں تھی کشمکشِ موج و کنار
اپنی ہی ذات میں گرداب نظر آیا تھا

ہائے وہ وقت کہ نظروں میں تھے آباد چمن
ہر بیاباں مجھے شاداب نظر آیا تھا

سچ کہو موجِ حوادث سے گزرنے والو!
تم کو دریا کوئی پایاب نظر آیا تھا؟

جس کے دامن میں بہاروں نے نمو پائی ہے
ہم کو بھی وہ گُلِ شاداب نظر آیا تھا

اب اسی دل سے اندھیروں کو حیا آتی ہے
یہی دل تھا کہ شرر تاب نظر آیا تھا

وہ بھی کیا وقت تھا جب ڈوب رہی تھی کشتی
ہر کنارا مجھے گرداب نظر آیا تھا

آج بھی یاد ہے وہ پہلی ملاقات جمالؔ!
اِس طرح، جیسے کوئی خواب نظر آیا تھا

۱۹۶۵ء، لاہور

○

غم زدہ دِل کو آہ کیا معلوم
رنج دے گی بہت خوشی کی بات

○

کوئی رہزن نہ راہ بر پایا　　ایک سایہ سا ہم سفر پایا
کِس نے دیکھی ہے شکل منزل کی؟　　کون کس کو تلاش کر پایا؟
لاکھ شمعیں جلیں اُمیدوں کی　　تیرگی سے کہاں مفر پایا
فِکر کے آخری مراحل ہیں　　خیر کو ماورائے شر پایا
لالہ و گُل ہیں سیمیائے بہار　　صرف کانٹوں کو معتبر پایا
اُس مُسافر کا حال کیا ہو گا　　جس نے منزل کو رہ گزر پایا
جب سیاہی نچوڑ کر دیکھی　　شب کو آئینۂ سحر پایا
گھر سے نکلے تھے سُوئے دشت جمالؔ!
دشت کو ہم نے اپنا گھر پایا

۱۹۷۰ء، لاہور

○

یہ عذاب و ثواب و زہد و گناہ　　میری ہستی کے پیچ و تاب میں ہے

○

یہ خوب مسیحا ہیں، دُعا کے نہ دوا کے
کہتے ہیں کہ بیمار حوالے ہیں خدا کے

جاگی تھی مرے دل میں ذرا وصل کی خواہش
ڈورے تری آنکھوں میں اُبھر آئے حیا کے

ہو جائیں نہ گُل تیرے چمن زار کے فانوس
بیٹھا ہے بیاباں میں کوئی شمع جلا کے

ہر نقش ہے دامن کشِ دل، دیکھ تو ہمدم!
وہ کتنے حسیں بن گئے تصویر میں آ کے

میں سمجھا کہ منجدھار سے اُبھرا ہے کنارا
جھونکے ابھی کچھ آئے تھے ساحل کی ہوا کے

اب ترکِ وفا کے لیے کچھ سوچ رہا ہوں
ترتیب دیے تھے کبھی آئین وفا کے

اب تک نہ کھُلا مقصدِ تخلیق کسی پر
مدّت سے ہم اک راز ہیں اِس ارض و سما کے

انجامِ گلستاں کی سویدا کو خبر ہے
وہ دیکھو چلا اپنے نشیمن کو جلا کے

سنہ ۱۹۶۲ء، لاہور

○

یہ ہُوا تیرے مسکرانے سے
سرخیاں بڑھ گئیں فسانے سے

○

عشق کی جنّت، دار کے پیچھے　　جیت بھی ہے اس ہار کے پیچھے
دل کی ہُوکیں، درد کی ٹیسیں　　بربط کے ہر تار کے پیچھے
پتّھر تانے لوگ کھڑے ہیں　　زنداں کی دیوار کے پیچھے
دھیمی دھیمی آہیں بھی ہیں　　پایل کی جھنکار کے پیچھے
گُل چیں باغ کو لُوٹ رہا ہے　　پھُولوں کے اک ہار کے پیچھے
سُونی سُونی ویراں گلیاں　　ہر چلتے بازار کے پیچھے
دل بھی کتنا سودائی ہے　　بھاگے ہے افکار کے پیچھے
کیا جانیں یہ لوگ سویدا!
صحرا ہے گلزار کے پیچھے

۱۹۶۴ء، لاہور

○

آج خود اپنی حرارت سے چٹخ جاتا ہے　　شیشہ جب سنگ تھا دیوانے کے کام آیا تھا

○

کوئی منزل نہ کوئی جادہ ہے
اب مسافر کا کیا ارادہ ہے

جینے جی غم سے کیوں نجات ملے
زندگی درد کا لبادہ ہے

دل یہ کہتا ہے چاند نکلے گا
تیرگی کل سے کچھ زیادہ ہے

جتنے غم ہوں مجھے عطا کیجے
دامنِ دل بہت کشادہ ہے

جب گھٹا چھائی پینے بیٹھ گئے
مے کشی اپنی بے ارادہ ہے

کم سہی التفاتِ دوست، مگر
میری اُمّید سے زیادہ ہے

کیا قیامت ہے چشمِ میگوں بھی
ہر نظر اشتہارِ بادہ ہے

ہم سویدا سے مل کے آئے ہیں
فکر رنگیں، مزاج سادہ ہے

سنہ ۱۹۶۷ء، لاہور

○

آپ آئے کہ زندگی آئی — آرزوؤں میں جان سی آئی
کروٹیں لی تھیں کچھ اندھیروں نے — ہم یہ سمجھے کہ روشنی آئی
عقل کا کونسا مقام ہے یہ — فکر سے بُو جنون کی آئی
آپ کی بندہ پروری کی قسم — ہم کو اب تک نہ بندگی آئی
کیا بنائے گا اے دلِ ناداں! — غم کی صورت اگر خوشی آئی
سَر میں کچھ یُوں سما گیا سودا — ق — دل میں اس طور خستگی آئی
ہنستے ہنستے نکل پڑے آنسو — روتے روتے کبھی ہنسی آئی

حُسن کی کج ادائیوں سے جمالؔ!
عشق میں کون سی کمی آئی

۱۹۶۸ء، راولپنڈی

○

جب تری بزمِ طرب میں آ گئے — اور بھی کچھ غم کے بادل چھا گئے
ملگجے تاروں کی مدھم روشنی — جانے کتنے داغِ دل کجلا گئے
زندگی تو لغزشوں کا نام ہے — ایک ہی ٹھوکر سے ہم گھبرا گئے
کیا قیامت ہے جُدائی کی گھڑی — اُن کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے
دیکھ اعجازِ خلوصِ مے کشی — جام اُٹھایا تھا کہ بادل چھا گئے
کس قدر محتاط تھے ہم عشق میں — اِس طرح سنبھلے کہ ٹھوکر کھا گئے

ہائے یہ طُولِ شبِ فُرقت جمالؔ!
جیسے وہ گیسو فضا پر چھا گئے

۱۹۶۱ء، مری

○

یک ضربِ تیشہ بُرد م، اندر ہوائے شیریں
ہر سنگ نعرہ می زد، من ہم صدائے شیریں

○

میکدہ ساز تری چشمِ کرم ہے ساقی! تجھ سے قائم مری مستی کا بھرم ہے ساقی!

نہ اُسے جام، نہ بادہ، نہ صراحی کی طلب تیرے دیوانے کو کچھ اور ہی غم ہے ساقی!

آخری بار مئے تُند کا اک جام پِلا دیکھ اس آگ میں بیمار کا دم ہے ساقی!

تیرے دامن سے بہاروں کی مہک آتی ہے تیری آغوش مجھے باغِ اِرم ہے ساقی!

پَے بہ پَے اتنی پلائی کہ مجھے ہوش نہیں یہ بھی منجملۂ اندازِ ستم ہے ساقی!

اِس کو انگور کا پانی نہ سمجھ، غور سے دیکھ اِس میں چلتی ہوئی تلوار کا دم ہے ساقی!

تُو ہی پہچان لے اب اپنے سویدا کا مزاج

تُو نے کیوں جام بھرا، اِس کا بھی غم ہے ساقی!

۱۹۶۵ء، لاہور

○

ابھی تک حُسن و اُلفت ارتقا کی زد سے باہر ہیں

جوانی مبتلائے نوجوانی اب بھی ہوتی ہے

○

کس تکلف سے مُسکراتے ہیں — یہی انداز کھائے جاتے ہیں

سانس کے ساتھ ہُوک اٹھتی ہے — آپ ہر وقت یاد آتے ہیں

بھیگی بھیگی اندھیری راتوں میں — ق — کیسے کیسے خیال آتے ہیں

جانے کس کس کی یاد اُبھرتی ہے — جانے کِس کِس کے غم ستاتے ہیں

تم بھی روشن کرو ستاروں کو — ہم بھی دل کا دِیا جلاتے ہیں

اپنی کِشتی تو ڈُوبنا ہی تھی — اپنے غم خوار یاد آتے ہیں

اُن سے کہنا جمالؔ! چپکے سے
ایک صاحب تمہیں بُلاتے ہیں

۱۹۶۲ء، لاہور

○

ہزار رنگ کے جلوے سمیٹ لائی ہے — مری نگاہِ تماشا طلسمِ ہوش رُبا

○

ہائے اُس جسمِ نُقرۂ ناب کی بُو — جیسے گلشن میں ہو گُلاب کی بُو

میکدہ دل کی طرح ویراں ہے — میکشو! اب کہاں شراب کی بُو

ہاتھ میں جام ، یار پہلو میں — گُل کی مہکار اور کباب کی بُو

عشق کے پیرہن کا چاک بنی — حسن کے عالمِ شباب کی بُو

مستی و بے خودی و مدہوشی — چاندنی رات اور شراب کی بُو

تیرے دم سے ہے اعتبارِ چمن — گلبدن! تجھ سے ہے گلاب کی بُو

سانس کے ساتھ آ رہی ہے جمالؔ!
جیسے جلتے ہوئے کباب کی بُو

سنہ ۱۹۶۴ء، لاہور

○

دِل سے اب خیر کی اُمیّد نہیں — دل کو وہ بانیِ شر یاد آیا

○

رنگِ مے آپ کے رُخسار سے آگے نہ گیا
عکس، آئینۂ انوار سے آگے نہ گیا

تیرے قدموں پہ قیامت نے بھی دم توڑ دیا
کوئی فِتنہ تری رفتار سے آگے نہ گیا

زندگی وصل کی اُمّید میں گزری اپنی
نالۂ دل لبِ گفتار سے آگے نہ گیا

سوزِ ہستی کی تپش، ساز کے پردوں میں کہاں
کوئی نغمہ، مرے اشعار سے آگے نہ گیا

زندگی کا کوئی طُوفاں، کوئی غم کا شعلہ
عظمتِ عشق کے معیار سے آگے نہ گیا

آستانِ حرمِ ناز کی توقیر تو دیکھ
میرا سایہ تری دیوار سے آگے نہ گیا

مثلِ پروانہ سُلگتا ہی رہا ذوقِ جمال
شعلہ بہ شمعِ رُخِ یار سے آگے نہ گیا

۱۹۶۷ء، راولپنڈی

○

تم نے سمجھا ہی نہیں ہے کہ محبّت کیا ہے
شوق میں جلتی ہوئی رات کی قیمت کیا ہے

○

وہ تصوّر میں لبِ شوق کا وا ہو جانا
وہ ترے رُخ کا فسوں سازِ حیا ہو جانا

آپ ہی ملنا گلے اپنی تمنّاؤں سے
آپ ہی اپنی وفاؤں کا صلا ہو جانا

خود نمُائی کا یہ عالم کہ بصد نکہت و رنگ
ہر گُلِ تر میں ترا جلوہ نمُا ہو جانا

دل ہی دل میں وہ مچلنا ترے ارمانوں کا
اور آنکھوں میں اُبھرنا تو حیا ہو جانا

سانحہ ہے دلِ غم دیدۂ الفت کے لیے
راگ کا ساز کے تاروں سے جُدا ہو جانا

یہی شبنم کا مقدر، یہی شبنم کا مآل
شعلۂ گُل کی حرارت سے فنا ہو جانا

اہلِ دل کے لئے پیغامِ رہائی ہے جمالؔ!
میرے افکار کا زندان بلا ہو جانا

سنۂ ۱۹۶۹ء، لاہور

○

تمہارے در سے جبیں کو اُٹھا نہیں سکتا
مری نگاہ میں ہیں ٹھوکریں زمانے کی

○

پیار سے تم نے کہا تھا "میرا دیوانہ" کبھی
جب سے اب تک ہوش میں آیا نہ مستانہ کبھی

اے نگاہِ یار! یہ قہر و غضب برحق، مگر
تندیِ مَے سے چٹخ جاتا ہے پیمانہ کبھی

وہ مری آغوش میں آ کر بہت شرمائے تھے
تھا کتابِ شوق میں شامل یہ افسانہ کبھی

شعلہ افگن ہو کے خود اپنے شرارِ شوق سے
شمع کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے پروانہ کبھی

شوق کی بے اختیاری بھی ادائے عشق ہے
اُن کے دامن سے لپٹ جاتا ہے دیوانہ کبھی

چشمِ ساقی کا فسوں ہے یا طلسمِ مَے کشی
خود بخود گردش میں آ جاتا ہے پیمانہ کبھی

مجھ کو تنہائی میں یُوں محسُوس ہوتا ہے جمال!
یہ در و دیوار بھی کہتے ہیں افسانہ کبھی

ستمبر ۱۹۶۷ء، لاہور

○

گلشن میں بھی تلاش رہی نوکِ خار کی
کیا کیجیے کہ دل ہی بیاباں نژاد ہے

○

جانِ دِل، جانِ تمنّا کون ہے　　تم سے اچھّا، تم سے پیارا کون ہے
ہم تمہارے، تم کسی کے ہو گئے　　ہم نہیں سمجھے، ہمارا کون ہے
دیکھنا! دل کی صدائیں تو نہیں　　اِس خموشی میں یہ گویا کون ہے
بندہ پَرور! آپ ہی فرمائیے　　ہم بُرے ٹھہرے تو اچّھا کون ہے
شب کے سناّٹے میں سُنکی تھی ہوَا　　آرزوؤں نے پُکارا کون ہے
موجۂ غم کے تھپیڑوں کے سِوا　　ڈُوبتے دِل کا سہارا کون ہے

اِس تماشا گاہِ عالم میں جمالؔ!
فیصلہ کیجے، تماشا کون ہے

فروری ۱۹۶۸ء، لاہور

○

اس بگیا میں یہ کون آیا　　کِس نے بدلا رنگ ہوا کا

○

کیا لاگ ہے مرے دلِ آشفتہ کار سے
الجھی ہوئی ہے موجِ صبا زلفِ یار سے

اے راہرو! یہیں کہیں مل جائے گا نشاں
منزل چھپی ہوئی ہے نظر کے غبار سے

بختِ سیہ کو زلف سے منسوب کر کے مَیں
ہم رشتہ کر رہا ہوں نسیمِ بہار سے

شاید سکونِ دل کی نکل آئے کوئی راہ
کچھ مشورہ کیا ہے دلِ بے قرار سے

اب عشرتِ شبانہ کی وہ رونقیں کہاں
اک انجمن تھی اس دلِ شب زندہ دار سے

بدلی ہوئی ہے کب سے فضا اس دیار کی
کچھ کہہ دیا ہو جیسے کسی نے بہار سے

اِس مے کدے میں پیتے پلاتے رہو جمالؔ!
دامن بچا رہے گا غمِ روزگار سے

۱۹۵۴ء، لاہور

○

ایں صفحۂ بے مایہ آئینۂ خوباں است
در نقشِ سویدا بیں ہر رُوئے گُلِ تازہ

○

دیکھا کیے سب لوگ مرے زخمِ جگر کو
سمجھا نہ کوئی آپ کے اندازِ نظر کو

دیوانہ بڑی دیر سے کچھ سوچ رہا ہے
منزل نہ سمجھ بیٹھے کہیں راہ گزر کو

بے دیکھے بھی ہے ناظر و منظور میں رشتہ
محرومِ نظارہ نہ سمجھ اپنی نظر کو

شُعلے سے لپکتے رہے سوزِ غمِ دل سے
یُوں آگ لگاتے رہے ہم اپنے ہی گھر کو

محسُوس ہُوا دل کو، جو پہنچے سرِ منزل
جیسے ابھی جانا ہے کسی اور سفر کو

آخر کوئی حد بھی ہے اِس آشفتہ سری کی
دیوار سمجھتا رہا مَیں آپ کے در کو

جب دیکھتا ہے میری طرف کوئی سویدا!
دامن سے چھُپا لیتا ہوُں مَیں دیدۂ تر کو

سنہ ۱۹۶۶ء، لاہور

○

شاید کوئی امیدِ دلِ مبتلا میں تھی
پچھلے پہر جو ہلکی سی خُنکی ہوا میں تھی

○

حسنِ نظر نواز کا جلوہ کہاں نہ تھا — شاید حریمِ دل کا کوئی پاسباں نہ تھا
نظّارۂ جمال کی حسرت کے باوجود — ذوقِ نظر بہ کوئی تماشا گراں نہ تھا
جلتے رہے خود اپنے ہی شعلوں میں اہلِ شوق — سچ پوچھیے تو اس میں کسی کا زیاں نہ تھا
جس بندگی میں رسم ہو، وہ بندگی نہیں — کعبہ بھی میں نے دیکھا، ترا آستاں نہ تھا
بے ہمتّی نے توڑ دیے راہرو کے پاؤں — راہِ وفا کا کوئی بھی پتھّر گراں نہ تھا
خود اپنے آب و رنگ سے کجلا گئے یہ پھول — کیا شدّتِ بہار کا مقصد خزاں نہ تھا؟

سب اپنے اپنے شوق میں گھُلتے رہے جمالؔ!
کوئی کسی کے واسطے آتش بجاں نہ تھا

ستمبر ۱۹۶۸ء لندن

○

اہلِ وفا کی ذات سے خوئے وفا گئی — گُل رہ گئے چمن میں وہ خوشبو ہوا ہوئی

○

طرزِ نگہ غضب کی، تبسّم بلا کا تھا
وہ فتنہ کار تھا کہ ہیولا قضا کا تھا

اپنی تباہیوں کا گِلہ بھی نہ کر سکے
اس میں بھی جیسے ہاتھ کسی آشنا کا تھا

دل کے مآل پر کسے الزام دیجیے
سر گشتۂ جنونِ وفا یہ سدا کا تھا

نالوں میں جذب و شوق نہ آہوں میں خستگی
یہ رنگِ عاشقی ترے رنگیں نوا کا تھا

ساغر دہک رہا تھا مئے شعلہ رنگ سے
دیکھا تو اس میں خون مرے مُدّعا کا تھا

کیسی وفا، کہاں کی محبّت شعاریاں
سارا وبال اس دلِ درد آشنا کا تھا

عرضِ وصال آج مزا دے گئی جمالؔ
چشمِ غضب طراز میں ڈورا حیا کا تھا

ستمبر ۱۹۶۸ء، لندن

○

اس طرح ڈال اپنے رُخ پہ نقاب
دِن نکل آئے رات کے پیچھے

○

جو ترا اعتبار کرتے ہیں — وہ تجھے شرمسار کرتے ہیں

دل کے زخموں سے تیرے دیوانے — اہتمامِ بہار کرتے ہیں

تاجِ شاہی ہے ان کے قدموں میں — جو فقیری شعار کرتے ہیں

جن کو معلوم ہے مآلِ بہار — خار کو گُل شُمار کرتے ہیں

دل تو پہلے ہی غم کا مارا ہے — آپ کیوں بے قرار کرتے ہیں

تیری نسبت سے خاکسار ترے — جانے کس کس کو پیار کرتے ہیں

زخم کھاتا ہے دل سویدا کا
شوخیاں گُل عذار کرتے ہیں

سنہ ۱۹۶۱ء، لاہور

○

جلوے سے ترے رنگ جو بکھرے تھے فضا میں — وہ سب سمٹ آئے مرے دامانِ وفا میں

○

سوزِ غم ساز بن کے آیا ہے　　شعلہ آواز بن کے آیا ہے
مستیٔ چشمِ ناز کیا کہیے　　سحر اعجاز بن کے آیا ہے
میکشوں کے لیے یہ ابرِ بہار　　میکدہ ساز بن کے آیا ہے
غنچۂ ناشگفتہ گلشن میں　　پھول کا راز بن کے آیا ہے
غیرتِ عشق مٹ چکی شاید　　غیر دمساز بن کے آیا ہے
شوق درماندۂ گرفتاری　　بہرِ پرواز بن کے آیا ہے

زخمِ دل اب نہ چھُپ سکے گا جمالؔ!
درد غمّاز بن کے آیا ہے

۱۹شنہء، لاہور

○

میری بربادی میں شامل کوئی غم خوار نہ تھا　　پھُول خود اپنی حرارت سے بھی مرجاتا ہے

○

عشق کا راز پا لیا ہم نے درد کو دل بنا لیا ہم نے

وقت پر کون کام آتا ہے؟ دوستو! آزما لیا ہم نے

آپ کی انجمن سے اُٹھ آئے دل کو پھر دل بنا لیا ہم نے

فطرتِ زندگی سے واقف ہیں درد بھی لا دوا لیا ہم نے

تیری فرقت میں یہ ہُوا محسوس جیسے پھر خود کو پا لیا ہم نے

عشق میں دل کی کیا بساطِ جمال!

کِس کو ہمدم بنا لیا ہم نے؟

۱۹۴۵ء، دھلی

○

چاندنی میں کِھل رہی ہیں یاسمن کی پتّیاں

نُور کی آغوش میں یہ صبح کی انگڑائیاں

○

کوئی شکوہ نہ کچھ شکایت ہے — درگزر شیوۂ محبّت ہے

ہجر ہے انتظارِ وصل کا نام — وصل محرومیوں کی قیمت ہے

آپ تو آپ، غیر بھی پیارے — کس قدر احترامِ الفت ہے

ہنستے ہنستے اُداس ہو جانا — یہ ادا کیا ہے اِک قیامت ہے

تجھ کو پالا ہے کن بہاروں نے — تجھ میں کس پھول کی صباحت ہے

دل میں اک آگ لگ رہی ہے جمالؔ!

عشق میں کس بلا کی حدّت ہے

۱۹۶۵ء، لاہور

○

نظارہ سوز سہی حسنِ جلوہ ساز جمالؔ!

میں اپنے دل سے نگاہوں کا کام لے لوں گا

کسی کے رُوئے دل آرا سے جب پلٹتی ہے — نگاہِ شوق بہت دیر تک لرزتی ہے

نہ جانے دیدۂ گُل چیں میں کیوں کھٹکتی ہے — کلی جو خار کے پہلو میں پھول بنتی ہے

ترے بغیر یہ کیا ہو گیا کہ گلشن میں — نسیمِ صبح بھی تلوار بن کے چلتی ہے

نہ اس میں کوئی مہک ہے، نہ تازگی، نہ سرور — ہوا یہ کونسی ہے آجکل جو چلتی ہے

نہ پھول ہیں، نہ شگوفے، نہ آشیاں، نہ بہار — چمن میں بلبلِ ناداں مگر چہکتی ہے

جمالؔ! جیسے ہوا سرسرائے پھولوں میں
کسی کی یاد مرے دل سے یوں گزرتی ہے

سنہ ۱۹۶۳ء، لاہور

اس بے خودی میں ہم ہیں بہت مطمئن جمالؔ!
ہوش آگیا تو خود کو سنبھالا نہ جائے گا

○

فروغِ فکر ہے احساس پر گراں یوں بھی
مرا یقین ہے ہمرشتۂ گماں یوں بھی

نہ رہروؤں کو پتہ اور نہ رہزنوں کو خبر
لُٹا ہے نکہتِ گیسو کا کارواں یوں بھی

نہ کوئی بجلی گری اور نہ کوئی شعلہ اُٹھا
چمن میں جلتا رہا اپنا آشیاں یوں بھی

ہمارے ہاتھ سے پیمانہ گر کے ٹوٹ گیا
کسی نے نام لیا تیرا ناگہاں یوں بھی

نہ گردِ راہ، نہ بانگِ جرس، نہ کوسِ رحیل
مرے خیال سے گزرے ہیں کارواں یوں بھی

نہ جانے کب سے من و تو کے فرق میں گم ہوں
جمال! عمر ہوئی اپنی رائیگاں یوں بھی

۱۹۶۵ء، لاہور

○

تم اپنے چہرے کو زلفوں سے کیوں چھپاتے ہو
ذرا تو منظرِ ماہِ تمام رہنے دو

○

عشق میں جُرأتِ اظہار کہاں سے لاؤں اور لاؤں بھی تو ہر بار کہاں سے لاؤں

زندگی کے یہ کڑے کوس، یہ تپتی ہوئی دُھوپ آپ کا سایۂ دیوار کہاں سے لاؤں

تم نے راتوں کو مری نُورِ سحر بخشا ہے تم سے بڑھ کر کوئی غمخوار کہاں سے لاؤں

ہوش اِک محشرِ آشوبِ تمنّا ہی سہی مستیٔ چشمِ فسوں کار کہاں سے لاؤں

یہ خنک رات، شبستاں کی یہ تاریک فضا گرمیٔ شعلۂ رُخسار کہاں سے لاؤں

بارہا عشق کے شانوں پہ جو بکھرے ہیں جمال!
ہائے وہ گیسوئے شبیار کہاں سے لاؤں

سنہ ۱۹۶۴ء، لاہور

○

لیلےٰ تو کب کی صرفِ غمِ قیس ہو چکی
بس اک ہیولا شوق کا محمل میں رہ گیا

○

تاج پوشی کے لیے کس نے بُلایا ہو گا
سر بکف چلیے وہی دار کا قصّا ہو گا

وہ مئے تُند کہاں جس سے جگر کٹ جائے
مُنہ میں بھینچے ہُوئے ساغر کا کنارا ہوگا

آپ کے دستِ شفا پر کوئی الزام نہیں
مجھ کو خود میرے ہی احساس نے مارا ہو گا

سانس کے ساتھ عجب رنگ کی خوشبو آئی
دل یہ کہتا ہے وہی پاس سے گزُرا ہوگا

ایک سایہ سا جو دیوار پہ منڈلاتا تھا
زلزلہ بن کے ترے قصر سے گزُرا ہو گا

اُس نے کچھ سوچ کے زلفوں کو بکھیرا ہے جمالؔ
میرے گھر آج بلاؤں کا بسیرا ہو گا

سنہ ۱۹۶۹ء، لاہور

○

تمہاری پلکوں پہ اُبھرا تو بن گیا گوہر
ہماری آنکھ سے ٹپکا تو اشک کہلایا

کبھی سرگشتگی میں جب خیالِ زلفِ یار آیا
بڑی مشکل سے قابو میں دلِ آشفتہ کار آیا

وہ اب کچھ سوچ لیں، عادت ہے جن کو صحنِ گلشن کی
یہ دیوانہ تو صحرا میں بھی اپنے دن گزار آیا

مری خوش اعتمادی کا بھرم کھل جائے گا یارب!
چمن میں موسمِ گل بھی اگر بیگانہ وار آیا

مری ہستی ترے جلوے سے پہلے بے حقیقت تھی
تجھے دیکھا تو اپنے آپ پر کچھ اعتبار آیا

اُمیدِ وصل سے کچھ اِس طرح دل جگمگا اُٹھا
کہ جیسے آئنہ خانے میں کوئی شعلہ کار آیا

لطافت رُوح کی پہچان سکتی ہے حقیقت کو
تری خاطر سویدا جامۂ ہستی اُتار آیا

سنہ ۱۹۶۰ء، مری

زمانہ تیز بہت تیز جا رہا ہے جمالؔ!
تم اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کے چلو

○

مشاطگیِ فصلِ بہاراں سے مجھے کیا　　　ہُوں دشت نشیں، صحنِ گلستاں سے مجھے کیا

ہیں دستِ جنوں کے لیے کچھ ڈھونڈ رہا ہُوں　　　خاکم بدہن! آپ کے داماں سے مجھے کیا

گلشن کی کسی چیز پہ جب حق نہیں میرا　　　پھر زمزمۂ جشنِ بہاراں سے مجھے کیا

پہنچی نہ کرن میرے سیہ خانۂ دل تک　　　زر پاش سہی، مہرِ درخشاں سے مجھے کیا

اک پھول بھی اس باغ کا قسمت میں نہیں ہے　　　پھر تذکرۂ تنگیٔ داماں سے مجھے کیا

پابندِ روایاتِ سلف ہُوں مَیں سویدا!
اِس دَور کے بدلے ہوئے انساں سے مجھے کیا

۱۹۶۵ء، لاہور

○

مختصر سا اک فسانا یاد ہے
آپ کا وہ مُسکرانا یاد ہے

○

صحنِ گلزار تھا گھنگھور گھٹا چھائی تھی ایک تصویرِ تمنّا مری تنہائی تھی

شعلۂ عشق سے کیا پوچھیں، اُسے کیا معلوم گرمیٔ حُسن میں کیوں شانِ پذیرائی تھی

شکوۂ تشنہ لبی، بن کے دُعا، نکلا ہے کتنی دل کش مرے ساقی! تری انگڑائی تھی

شمعِ اُمّید نے جس کے لیے دم توڑ دیا وہ سحر چاکِ گریباں میں نظر آئی تھی

آج بھی کیا وہی انساں نظر آتا ہے کہیں جس کی عظمت کی فرشتوں نے قسم کھائی تھی

ایسے ہی سُوئے بیاباں نکل آیا ہُوں جمالؔ!
دل میں وحشت تھی طبیعت مری گھبرائی تھی

۱۹۶۱ء، لاہور

○

نکلنے کے لیے بیتاب ہے ہر آرزو دل کی
ترے آنے سے برہم ہو گیا ہے رنگ محفل کا

○

مہک گلاب کی تیرے بدن سے آئی ہے — صفائی تجھ میں مگر یاسمن سے آئی ہے

صبا نے پھر کسی گُل کی قبا کو چاک کیا — عجیب رنگ کی خوشبو چمن سے آئی ہے

وہ بوئے خوش کہ مشامِ وفا کی جان بنی — نہ جانے کون سے گُل پیرہن سے آئی ہے

گُلوں نے مُنہ پہ مَلی خاک اک نشیمن کی — خبر یہ اُڑتی اُڑاتی چمن سے آئی ہے

عجب طلسم ہے، یہ کارگاہِ فکر و نظر — مجھے تو عقل ہی دیوانہ پن سے آئی ہے

جمالؔ! گردشِ دوراں کا کیا کروں شکوہ
بلائے دل، مرے دل کی گھٹن سے آئی ہے

۱۹۶۷ء، لاہور

○

مار ڈالے گی آگ سینے کی
دوستو! کوئی چیز پینے کی

○

دل کاروبارِ غم سے گریزاں نہیں رہا
یہ اور بات ہے کہ پریشاں نہیں رہا

تم کیا بدل گئے کہ زمانہ بدل گیا
وہ گُل نہیں رہے وہ گلستاں نہیں رہا

اللہ رے جنونِ محبّت، کہ اِن دنوں
کچھ امتیازِ جیب و گریباں نہیں رہا

ساری بلائیں موجۂ دریا کے ساتھ تھیں
کشتی کا ڈوبنا تھا کہ طوفاں نہیں رہا

کچھ ایسے گُل کھلائے نسیمِ بہار نے
بلبل کو اعتبارِ گلستاں نہیں رہا

یہ بھی نگاہِ دوست کا اعجاز ہے جمالؔ!
دل پائمالِ گردشِ دوراں نہیں رہا

سنہ ۱۹۴۳ء، دہلی

○

یہاں بھی ہجر کے صدموں کو ہم بھُلا نہ سکے
تمہارے پاس بھی آکر سکون پا نہ سکے

○

مُنہ سے کچھ اپنے کہے بیمار کیا — کیا خبر اِس دل کو ہے آزار کیا

جن کے دم سے رونقیں تھیں بزم کی — پھر نہ آئیں گے کبھی وہ یار کیا

تیز، پروازِ تخیُّل! اور تیز — تیرے آگے برق کی رفتار کیا

سامنے آئینہ رکھ کر دیکھیے — کہہ رہی ہے نرگسِ بیمار کیا

تیرے دم سے مستیوں کی آبرُو — میکدہ کیا، جام کیا، میخوار کیا

کچھ کہو تو کس طرف رُخ ہے جمالؔ!

سامنے زنداں کی ہے دِیوار کیا

۱۹۶۵ء، لاہور

○

مرا تخیُّل ہے کارفرما، حدودِ فکر و نظر سے آگے

اک اور دُنیا بنا رہا ہوُں نظامِ شمس و قمر سے آگے

○

گلشن میں جا کے کیجیے کیا یار کے بغیر
پھُولوں کی سیر اور لب و رُخسار کے بغیر

ساقی! مجھے قبُول، تری بے نیازیاں
میخانہ چل سکے گا نہ مے خوار کے بغیر

تُجھ مُجھ کو دِل کا حال سُنانے سے فائدہ؟
کیا بات کیجے، محرمِ اسرار کے بغیر

دِیوانگی کی لاج بھی رکھنی ضرور ہے
گھر اِک بنایا چاہیے دیوار کے بغیر

یوسف ہزار، رونقِ بازارِ مصر ہو
بنتی نہیں ہے بات خریدار کے بغیر

پاؤں میں اُس کے مہندی رچی دیکھ کر جمال!
شوخی فضا میں کھُل گئی رفتار کے بغیر

سنہ ۱۹۶۷ء، کراچی

○

لپٹی ہوئی ہے دل کے دھندلکوں میں اُسکی یاد
شیشے میں عکسِ یار کبھی ہے کبھی نہیں

جیسے کسی کے رُخ کی بہت نرم نرم آنچ
پھُولوں پہ یہ نکھار کبھی ہے کبھی نہیں

ایک غارتِ گرِ ایماں کی تمنا لے کر
آج بازار سے ہم آئے یہ سودا لے کر

جانے کیا ہو گئی اربابِ حرم کی غیرت
کتنے مسرور ہیں آدابِ کلیسا لے کر

عمر گزری ہے جھلستے ہوئے صحراؤں میں
کیا کریں گے تری دیوار کا سایا لے کر

پھر شبِ غم کے گزرنے کی دُعا کیوں مانگوں
صبح بھی آئے گی ھنگامۂ فردا لے کر

گھر سے نکلے تھے کہ پہنچیں گے ترے کوچے میں
مطمئن ہو گئے ہم دشت کا رستا لے کر

آخر اک دن تو سویدا کو فنا ہونا ہے
اور جی لے ترے دامن کا سہارا لے کر

۱۹۶۷ء، لاہور

جہل میں نورِ آگہی بھر دے
ظلمتِ شب میں چاندنی بھر دے

میری خاموشیوں کے مرقد میں
اپنے لہجے کی نغمگی بھر دے

○

کب بھڑک اُٹھّیں گے جذبات، مجھے کیا معلوم
دل میں چُبھ جائے گی کیا بات، مجھے کیا معلوم

وہ نہ آئیں گے تو بے کیف رہے گا موسم
کس طرح گزرے گی برسات، مجھے کیا معلوم

کیا گزرتی ہے خدا جانے ملاقات کے وقت
کیسے ہوتے ہیں وہ لمحات، مجھے کیا معلوم

بے ارادہ یُونہی بھُولے سے چلا آیا ہُوں
آپ سے ملنے کے اوقات مجھے کیا معلوم

میں ہُوں اور وعدۂ فردائے قیامت کا فریب
اُن سے کب ہو گی ملاقات، مجھے کیا معلوم

کس کے بالوں کی مہک راتوں کو آتی ہے جمالؔ!
ہے یہ کس گُل کی کرامات مجھے کیا معلوم

سنہ ۱۹۶۷ء، لاہور

○

مدّت سے جراحت کا چمن دل میں کھِلا ہے
سرکار کی پھر جنبشِ مژگاں سے مجھے کیا

نظر رکھّیں جو تیرے گلستاں پر
گرے بجلی ہمارے آشیاں پر

○

غمِ زندگی کو دے نہ سکا بادۂ خوشی — سوزِ حیات بن نہ سکا سازِ بے خودی
وہ بھی غمِ حیات کے طوفاں میں کھو گئی — یک گونہ بے خودی جو تری عاشقی میں تھی
محرومیِ مآلِ محبت کے باوجود — ہر آرزو چراغِ وفا کے جلا گئی
پلتی ہے زندگی کبھی آغوشِ مرگ میں — دُنیا میں آ کے زہر بھی پیتا ہے آدمی
تڑپی ہے مدتوں مرے سینے میں بن کے برق — وہ راگنی جو ساز کے دل میں اُتر گئی

عنقا ہُوئے جمال! وہ اہلِ نظر تمام
اب کس سے داد چاہیے معیارِ شعر کی

سنہ ۱۹۶۷ء، راولپنڈی

○

وہ محبت اب کہاں، کچھ لاگ باقی رہ گئی — سب شرارے بُجھ گئے، یہ آگ باقی رہ گئی
کون اب لا کے دکھائے اُسے اُجڑا گلشن — برق کو اپنی شرارت کی خبر کیسے ملے

○

سوزِ غم سے جو داغ ہوتا ہے — گوہرِ شب چراغ ہوتا ہے

دل، جسے کہیے کائنات کا راز — آپ اپنا سراغ ہوتا ہے

جب ترے در پہ سر جھکاتا ہوں — آسماں پر دماغ ہوتا ہے

وہ مسافر جو تھک کے بیٹھ رہے — رہ گزر کا چراغ ہوتا ہے

آنکھ اگر ہو ادا شناسِ بہار — صرف اک پھول، باغ ہوتا ہے

غم سے پہلو بچا رہے ہو جمالؔ
غم سے کس کو فراغ ہوتا ہے

دسمبر ۱۹۶۹ء، لاہور

○

عقدہ کھلا یہ ناخنِ تدبیرِ فکر سے — ہیں جتنی الجھنیں تری زلفوں کے خم میں ہیں

حقیقت سے پیدا ہوا ہے مجاز — حقیقت نہیں تو فسانہ نہیں

○

ہم جو اِک دُوسرے کے پیارے ہیں — ایک ندّی کے دو کنارے ہیں
ساغرِ مے سے شیشۂ دل تک — استعارے ہی استعارے ہیں
سنگریزوں سے کھیلنے والو! — سنگریزے نہیں شرارے ہیں
اُس سے پُوچھو کہ زندگی کیا ہے — جس نے رو رو کے دن گزارے ہیں
خلوتِ دل بھی خوب ہے لیکن — جو نظر آئیں وہ نظارے ہیں
رہگزاروں کے یہ نشیب جمالؔ
میری افتاد کے سہارے ہیں

جنوری ۱۹۶۹ء لاہور

○

صبحِ عشرت شبِ دیجور میں کھو جائے گی — زندگی موت کے آغوش میں سو جائے گی

ایک شعلہ سا لپکتا ہے جمالؔ! — کیا مزا ہے دُور کی آواز میں

○

چلتا رہا سماج زمانے کے ساتھ ساتھ — دنیا کا ہے رواج زمانے کے ساتھ ساتھ

طرزیں بدل بدل کے سُنائی ہے داستاں — بجتی رہی یہ باج زمانے کے ساتھ ساتھ

نیرنگیوں میں اہلِ وفا کا ثبات دیکھ — بدلا نہیں مزاج زمانے کے ساتھ ساتھ

ثروت کی بارگاہ میں افلاس کے دھنی — دیتے رہے خراج زمانے کے ساتھ ساتھ

محرومیوں کا کوئی مداوا نہ ہو سکا — بدلے بہت علاج زمانے کے ساتھ ساتھ

ملتے نہیں قدم سے قدم کیا کروں جمالؔ!

چلنا پڑا ہے آج زمانے کے ساتھ ساتھ

س۱۹۶۳ء، کراچی

○

میری آنکھیں، جنہیں ظلمت میں تجلّی کی اُمید

میری جراَت، جسے منجدھار میں ساحل کی تلاش

چَین سے حُور کی آغوش میں سو جائے گی

دامنِ زُہد میں لپٹی ہوئی عِصیاں کی تڑپ

○

یہ مرتبہ دیا ہے ترے انتظار نے ۔۔۔ مرکز بنا لیا مجھے لیل و نہار نے

سُرخی جواب بن گئی عرضِ نیاز کا ۔۔۔ گویا کیا ہے رنگ کو رُخسارِ یار نے

تجھ سے چمن میں لالہ و گُل کی تھی آبرُو ۔۔۔ تیرے بغیر داغ ہی کھائے بہار نے

پھر یاس و آرزو میں بہم کشمکش ہوئی ۔۔۔ پھر بے قرار کر دیا دل کے قرار نے

کھولی کچھ اس ادا سے کلی نے چمن میں آنکھ ۔۔۔ بے اختیار چوم لیا مُنہ بہار نے

ہر زخم داغ بن کے چمکنے لگا جمالؔ!

کیا گُل کھلائے ہیں دلِ امّیدوار نے

سنہ ۱۹۷۸ء، لاہور

○

پھول مُٹھی میں دباؤ گے، کچل جائے گا

سبزہ سائے میں اُگاؤ گے تو جل جائے گا

حُسن کو جذب کرو ریت میں پانی کی طرح

سکّہ جب سنگ پہ پٹخو گے اُچھل جائے گا

○

عشق میں ایک "فتنہ قامت" کے
ہم بھی قائل ہُوئے قیامت کے

لُطفِ گُل، کیفِ مُل، فروغِ بہار
سب ہیولے ہیں تیری صورت کے

اے شبِ غم! مری بساط بھی دیکھ
اور پردے نہ ڈال ظلمت کے

فقر کیا اور بادشاہی کیا
سب کرشمے ہیں تیری قدرت کے

یُوں مِلے، جیسے کوئی بات نہیں
آدمی نکلے وہ مُروّت کے

ساری خوشیاں جمالؔ! اُن کے لیے
سارے آزار میری قسمت کے

سنہ ۱۹۶۶ء، لاہور

○

جانے کیا راز اُس کے ساتھ گیا
مَرنے والے نے کُچھ کہا ہی نہیں

دولتِ یاس مل گئی ہے جمالؔ!
دل میں اب کوئی مُدّعا ہی نہیں

○

لو گھٹا چھائی، آ گئی برسات — اور بھی آگ بن گئے جذبات

پھول اب پھانس بن کے چبھتے ہیں — آپ کے دم سے تھی بہار کی بات

جب وہ رُخ سے نقاب اُلٹیں گے — نور بن جائے گی اندھیری رات

موت بھی جن سے بچ کے چلتی ہے — حاصلِ عُمر ہیں وُہی لمحات

دل کو گھیرے ہوئے ہے آپ کی یاد — جیسے صحرا کے گرد ہوں باغات

مِل کے دیکھو کبھی سویدا سے

خوش نظر، خوش کلام، خوش اوقات

۱۹۶۸ء، لاہور

○

صبحِ اُمّید بھی آشوبِ تمنّا ہوگی — ہجر کی رات سے اب حشر کا دن دُور نہیں

اسی بہار میں بلبل نے آشیاں چھوڑا — اسی بہار میں ہم بھی ہوئے خرابِ جمال

○

دل میں ہم بات رکھیں گے تو کدورت ہو گی
اور کچھ مُنہ سے کہیں گے تو شکایت ہو گی

کچھ تو باقی ہیں ابھی اگلی بہاروں کے نشاں
مجھ سے جب آپ ملیں گے تو مسرّت ہو گی

وہ کبھی جُرأتِ انکارِ تمنّا تو کریں
ایک تصویرِ تمنّا مری صُورت ہو گی

درد کو اور بڑھانے کی دوا دیتے ہیں
یہ بھی منظور کہ اس میں کوئی حکمت ہو گی

شررِ عشق کو شعلہ تو بنائے غمِ ہجر
پھر تری زُلف کے سائے کی ضرُورت ہو گی

غنچے افسردہ ہیں اور پھُول جگر چاک جمالؔ!
سیرِ گلزار سے کچھ اور بھی کلفت ہو گی

سنہ ۱۹۶۴ء، لاہور

○

اے گریباں! مُژدۂ فصلِ بہاری کیا سنُوں؟
شومیِ قسمت کہ وہ دستِ رسا جاتا رہا

جانے کس کم بخت نے یہ گُل کھلائے ہیں جمالؔ!
اس چمن میں اعتبارِ آشنا جاتا رہا

○

طاقِ دل میں رکھ دیا کس نے چراغ بندگی ؟ عشق کی تاریکیوں کو روشنی کیوں مل گئی

اِک حقیقت، اِک فسانہ، اِک یقیں، اِک واہمہ ماورائے فہم ہے رمزِ حیاتِ آدمی

برق کا کوندا سا لپکا اور اندھیرا چھا گیا روشنی آنکھوں میں آتے ہی کہاں گُم ہوگئی؛

کاروانِ شوق پہنچا منزلِ رُخسار تک بن گئی بانگِ جرس تیرے لبوں کی نغمگی

یُوں شباب آیا کہ پھُولوں کو پسینہ آگیا یُوں نقاب اُلٹی کہ رعنائی فضا میں گھُل گئی

فتنۂ ادراک نے یہ خاک اُڑائی ہے جمال!

اک بگولا دشت کا زعمِ دماغِ فلسفی

سنہ ۱۹۶۵ء، لاہور

○

جانِ بہاراں پاس نہیں ہے

پھُولوں میں بُو باس نہیں ہے

غم کے سائے اتنے گہرے

پرچھائیں بھی پاس نہیں ہے

○

ہم بساطِ دل پہ یُوں ڈگمگا کے چلتے ہیں — جیسے دشت میں دریا راستے بدلتے ہیں

مِل گئے تمنّا کو جھُولنے امیدوں کے — جیسے بچّے ماؤں کی گود میں بہلتے ہیں

تیرگی پلٹتی ہے چشمۂ ضیا بن کر — اک چراغ بجھتا ہے سو چراغ جلتے ہیں

قُرب میں بھی دُوری ہے وصل ہو تو کیونکر ہو — دل کے ہر کنارے سے فاصلے نکلتے ہیں

وادیٔ تمنّا میں، مَیں وہ ذرّہ بیتاب — جس کو دیکھ کر طوفاں اپنا رُخ بدلتے ہیں

اے جمالؔ! کیا کہیے ان کی سرد مہری کو
برف کو بھی چھُونے سے ہاتھ میرے جلتے ہیں

اکتوبر ۱۹۶۹ء، لاہور

○

دل میں یُوں عشق کا شعلہ بھڑکے — چہرہ ہمرنگِ شفق ہو جائے

اتنی حسرت تو ہو آنکھوں میں مری — تُو مجھے دیکھے تو فق ہو جائے

○

اُس بت کو نہ دیکھوں تو یہ کُفرانِ نظر ہے
اے زہدِ نظر! دعوتِ ایمانِ نظر ہے

منظر ہے وہی جس پہ ٹھہر جائیں نگاہیں
جلوہ جسے کہتے ہیں وہ امکانِ نظر ہے

ہر گل، چمنستاں ہیں ہے فردوس بداماں
یہ سیلِ بہاراں ہے کہ طغیانِ نظر ہے

زنجیر ہیں میرے لیے پھولوں کی قطاریں
دیوارِ گلستاں مجھے زندانِ نظر ہے

نظّارہ تو اِک کیفیتِ جذب ہے، ہمدم!
ہم لاکھ سمجھتے رہیں عرفانِ نظر ہے

یہ فکر، یہ تخئیل، یہ اسلوب، سویدا!
اک چشمِ فسوں ساز کا فیضانِ نظر ہے

ستمبر ۱۹۷۰ء لاہور

○

طے ہو چکے جمال! محبّت کے مرحلے
ہم جبر و اختیار سے آگے نکل گئے

بے اعتباریوں کا سہارا لیے ہُوئے
دنیائے اعتبار سے آگے نکل گئے

○

بہانہ چاہتی ہے عقل، بے خُودی کے لیے
تڑپ رہی ہے نظر برقِ آگہی کے لیے

مری نظر کو یہ کن ظُلمتوں نے آ گھیرا
تری نقاب اُٹھائی تھی روشنی کے لیے

تمھاری یاد کا نشتر چبھوئے بیٹھے ہیں
یہ روگ ہم نے لگایا ہے جینے جی کے لیے

بُتوں نے ہم کو خدائی میں کر دیا رُسوا
بُتوں کو ہم نے تراشا تھا بندگی کے لیے

تمھاری رات ستاروں سے جگمگاتی ہے
مری سحر بھی ترستی ہے روشنی کے لیے

دیارِ شوق کو بخشی ہے دل کشی اس نے
جمالؔ! غم تو حلاوت ہے زندگی کے لیے

۱۹۶۶ء، لاہور

○

جیسے کوئی پُرانا سا ٹُوٹا ہُوا مزار
یہ زندگی کا حال تمھارے بغیر ہے

دل کی حیات ایک مسلسل طلب میں ہے
اس رہ نوردِ عشق کی منزل کہیں نہیں

○

کوئی دل سوز تصور، کوئی دل ساز جمال — اک قیامت ہے مرے دل کے لیے حسنِ خیال

تیرگی اب تو اُترنے لگی بینائی میں — اے مرے چاند! مجھے ہجر کی ظلمت سے نکال

رازِ ہستی بہ نظر کی تو سمجھ میں آیا — زندگی واہمہ، ہم لوگ برے وہم و خیال

میری محرومیِ تقدیر پہ ہنسنے والے! — میری ہمت سے نہ کر دُوریِ منزل کا سوال

وصل سے پہلے مجھے اور طرح کے غم تھے — وصل کے بعد مجھے اور طرح کا ہے ملال

سیمیا زار سے کچھ کم نہیں یہ بزمِ وجود
واقعہ وہم ہے، اور وہم حقیقت ہے جمال!

۱۹۶۸ء، لاہور

○

دل کی تباہیوں سے وفا معتبر ہوئی — دُنیا رہینِ منتِ کون و فساد ہے

دلِ افسردہ سے شاداب بیانی مانگے — شعر ہر دور میں شاعر سے جوانی مانگے

○

چمن والے ہیں بدظن اور تُو بیزار ہے ساقی ۔۔۔ تو پھر کیوں زندگی میرے گلے کا ہار ہے ساقی

یہ کون آیا حنائی ہاتھ سے ساغر کو چھلکاتا ۔۔۔ یہ کس رنگیں صدا پازیب کی جھنکار ہے ساقی

تُو اپنے ساغر و مینا کی گردش تیز تر کر دے ۔۔۔ زمانہ میکشوں کے درپئے آزار ہے ساقی

تری چشمِ سیہ کی آبرُو کا پاس ہے، ورنہ ۔۔۔ بقیدِ ہوش پینے سے کسے انکار ہے ساقی

بہت کچھ روشنی ڈالی گئی دل کی حقیقت پر ۔۔۔ مگر دل آج تک منجملۂ اسرار ہے ساقی

تجھے دیکھا، پھر اپنے آپ کو دیکھا سویدا نے
بہت سوچا مگر انجام کچھ بیکار ہے ساقی

۱۹۴۶ء، دھلی

○

جانے کیا کیا خیال آتے ہیں ۔۔۔ جب کوئی ہمکنار ہوتا ہے

جبرِ تسلیم، پھر بھی اِنساں کو ۔۔۔ کچھ نہ کچھ اختیار ہوتا ہے

○

گرفتار ہوگا بلا میں زیادہ　　یہ دل اُڑ رہا ہے ہوا میں زیادہ
مری سجدہ ریزی نے یہ گُل کھلائے　　کشش بڑھ گئی نقشِ پا میں زیادہ
بجز ماندگی اب نہ منزل، نہ راہیں　　قدم اُٹھ گئے ابتدا میں زیادہ
ان اشکوں نے مشکل کیا سانس لینا　　نمی ہو گئی ہے ہوا میں زیادہ
بچھڑ جائیں گے وقت کے کارواں سے　　جو اُلجھے رہے رہنما میں زیادہ

سویدا! ذرا زخمِ دل کو تو دیکھو!
شفق گھل رہی ہے فضا میں زیادہ

۱۹۶۹ء، لاہور

○

پائے طلب کو نوکِ سرِ خار بن گئیں　　ناچاریاں بھی عشق کا پندار بن گئیں
لمحے جمودِ شوق سے جُڑتے رہے جمال!　　صدیاں سمٹ کے راہ کی دیوار بن گئیں

○

دل کی دھڑکن صدا نہ بن جائے — ضبطِ غم التجا نہ بن جائے
کوئی حد بھی ہے سجدہ ریزی کی — یہ جبیں نقشِ پا نہ بن جائے
ترچھی نظروں سے یوں نہ دیکھ مجھے — کج ادائی، ادا نہ بن جائے
یہ جبیں اور اُس کا نقشِ قدم — بندگی بھی خطا نہ بن جائے

جس کو تم بُت سمجھ رہے ہو جمالؔ!
دل میں رہ کر خدا نہ بن جائے

۱۹۶۵ء، مدائن

○

ہزار شکوۂ بیداد گفتنی تھے جمالؔ! — وہ اس ادا سے ملے جیسے کچھ ہُوا ہی نہیں

○

تجھ کو خُود اپنے ہی سائے پہ گماں گزرا ہے — تیرا وحشی ترے کُوچے سے کہاں گزرا ہے

جھلملانے لگے فانوس تری محفل کے — کوئی پروانہ مگر شعلہ بجاں گزرا ہے

نغمگیِ نالۂ ہجراں میں کہاں سے لاؤں — سوزِ دل سازِ بہاراں سے کہاں گزرا ہے

پھُول گُلشن میں جگر چاک نظر آتے ہیں — سرو کے سائے پہ زنداں کا گماں گزرا ہے

غم کی جھنکار میں شامل تھی شکستِ دل بھی — میرے نالوں پہ تغزّل کا گماں گزرا ہے

ٹمٹماتے ہوئے دیکھے ہیں ستاروں کے چراغ — کہکشاں سے ابھی انسان کہاں گزرا ہے

دل کبھی مرکزِ طغیانِ تمنّا تھا جمالؔ!

آج اِس شہر پہ صحرا کا گماں گزرا ہے

۱۹۶۶ء، لاہور

○

ناموسِ عاشقی کو نہ بدنام کر جمالؔ! — بہتر یہی ہے دل میں رہے مُدّعائے دل

○

گُلوں میں رنگ فضاؤں میں روشنی ہوگی
مرے نہ ہونے سے کس بات میں کمی ہوگی

نہ جانے تشنگیِ شوق کس فریب میں ہے
شراب اپنی حرارت سے اُڑ گئی ہوگی

تمہارے آنے سے بدلے گا تیرگی کا لباس
جو تم نہ آئے تو پھر کیسے روشنی ہوگی

جو اہلِ شوق کے سائے سے بھی بھڑکتے ہیں
صبا! تُو ایسے غزالوں سے کب ملی ہوگی

ہماری عقل کو رہبر کی جستجو ہے جمال!
جب ایک جام پئیں گے تو آگہی ہوگی

۱۹۶۷ء، لاہور

○

آرزو بنتی جا رہی ہے صلیب
سانس بھی اب لیا نہیں جاتا

شہرِ دل سے دیارِ معنی کو
اب کوئی راستا نہیں جاتا

○

تکمیلِ بشر باعثِ تخلیقِ بشر ہے — یہ راز وہ ہے جس کی زمانے کو خبر ہے

دل میں جو بہاریں ہیں تجھے کیسے دکھاؤں — دامن سے ترے دور مِرا دیدۂ تر ہے

دیکھی ہے بھلا کس نے مری آنکھ کی شبنم — پھولوں کے تبسّم کی زمانے کو خبر ہے

تجھ بِن کسی منظر پہ یہ آنکھیں نہیں کھُلتیں — تجھ بِن کسے دیکھوں کہ یہ اسرافِ نظر ہے

جب رختِ سفر کھولنے لگتا ہوں سویدا!

محسوس یہ ہوتا ہے ابھی اور سفر ہے

سنہ ۱۹۶۹ء، لاہور

○

میں خود چشمۂ کیفِ نظر ہوں — مری نظّارہ جوئی کو نہ دیکھو

مِرے دل میں کنول سے کھِل رہے ہیں — مری افسردہ روئی کو نہ دیکھو

○

پامال ہو چکے ہیں غمِ دوجہاں سے ، ہم
اب اپنے دل کو ڈھونڈ کے لائیں کہاں سے ہم

نیچی نظر کے ساتھ رہے گا سکوتِ لب
شکوہ کریں گے آج تمہاری زباں سے ہم

شاید فریبِ عشق تھی منزل کی جستجو
پھر اُس مقام پر ہیں چلے تھے جہاں سے ہم

اب ہم سے ہے جہاں میں بہاروں کی آبرو
کچھ پھول چن کے لائے ہیں اس گلستاں سے ہم

یہ جوشِ بندگی ہے کہ دیوانگی جمال!
ٹکرا رہے ہیں سر جو کسی آستاں سے ہم

سنہ ۱۹۶۵ء، لاہور

○

سوزِ دل کا مزا بیاں میں نہیں
آگ سینے میں ہے زباں میں نہیں

ہم دِل کو چھوڑ آئے دیارِ حبیب میں
داغِ فراق رہ گیا لیکن نصیب میں

○

مِرا سوزِ وفا، سازِ بہاراں بن گیا ہو گا
یہ شعلہ بڑھتے بڑھتے اب چراغاں بن گیا ہو گا

مِری وحشت کے آگے کیا حقیقت تھی سلاسل کی
مِرا سایہ ہی خود دیوارِ زنداں بن گیا ہو گا

شفق میں کچھ ہیولے بن رہے تھے رنگ و نکہت کے
ہمارے بعد صحرا بھی گلستاں بن گیا ہو گا

وہ لمحہ جو کسی کے ساتھ ہنستے بولتے گزرا
شبِ ہجراں میں اِک شمعِ فروزاں بن گیا ہو گا

سویدا! اب نمک پاشِ جراحت کی ضرورت کیا
تُرخ کر زخمِ دل خُود ہی نمکداں بن گیا ہو گا

۱۹۶۵ء، لاہور

○

ایسے موسم میں نہ پینا ہے حرام
یہ گھٹائیں پھر میسّر ہوں نہ ہوں

اور سُن لو میرے دل کی دھڑکنیں
یہ صدائیں پھر میسّر ہوں نہ ہوں

○

کسی صورت سے کم ہوتی نہیں دل کی پریشانی
خُدا جانے کہاں پہنچائے گی آشفتہ سامانی

زمانے کی کشاکش سے کبھی فرصت نہیں ملتی
جو تم آئے تو پیدا ہو گیا ذوقِ غزل خوانی

اندھیرا ایسا چھایا ہے کہ چھٹنے میں نہیں آتا
مری قسمت میں لکھّی تھی شبِ فُرقت بھی طُولانی

وہی مجنُوں صفت باتیں، وہی لیلےٰ صفت راتیں
وہی دل کی جنُوں خیزی، وہی آشُفتہ سامانی

سویدا! اِس رہائی میں بھی کوئی راز مُضمر ہے
بڑی مشکل سے آئے تھے مجھے آدابِ زِندانی

۱۹۶۱ء، دھلی

○

ہوائیں کیوں تیز چل رہی ہیں، ہے موج در موج کیوں تلاطم
سُنا ہے کوئی جُنوں کا مارا، خود اپنی کشتی ڈبو رہا ہے

بھکی ہوئی پھرتی ہیں گھنگھور گھٹائیں کیا
وہ آئیں تو کیوں آئیں، ہم اُن کو بُلائیں کیا

○

ارمانوں کے شیش محل کو توڑ دیا دیوانہ پن ہیں
پتھر سے شیشے کا رشتہ جوڑ دیا دیوانہ پن ہیں

دیکھ کے پھولوں کی رعنائی، کیا جانے کیا دل میں سمائی
شاخ کا رُخ صحرا کی جانب موڑ دیا دیوانہ پن ہیں

اِس پر مجھ کو طیش آیا کہ گُل سے کانٹوں کا کیا رِشتہ
پھول کی اِک اِک شاخ کو میں نے توڑ دیا دیوانہ پن ہیں

طوفانوں سے ڈرنے والو! مجھ پاگل کا ہوش تو دیکھو
کشتی کو منجدھار میں لا کر چھوڑ دیا دیوانہ پن ہیں

دیکھ کے ساقی کی نظروں کو بھر کے ٹھنڈی سانس سوبدا!
ساغر کو اِس زور سے پٹخا، توڑ دیا دیوانہ پن ہیں

۱۹۶۴ء، لاہور

○

یہ کس کی زلفِ معنبر سے جذب کی ہے شمیم
کہ گلستاں کی ہوائیں ہیں مشکبار اب تک

چلی نسیم، کِھلے پھول، فصلِ گُل آئی،
چمن میں بلبلِ شیدا ہے بے قرار اب تک

○

وصل ممکن بھی ہے محال بھی ہے　　یہ حقیقت بھی ہے خیال بھی ہے

تیرے در پر جُھکا نہیں سکتا　　میرے سر میں ترا خیال بھی ہے

زیرِلب وہ بھی مسکراتے ہیں　　یہ غزل اپنے حسبِ حال بھی ہے

ہم جو یُوں سر جُھکائے بیٹھے ہیں　　اِس خموشی میں عرضِ حال بھی ہے

ہر بلندی میں پستیاں ہیں جمالؔ!

ہر ترقّی میں کچھ زوال بھی ہے

سنہ ۱۹۶۴ء، لاہور

○

اس میں اک شانِ دلرُبائی ہے

بے سبب تو نہیں تغافل بھی

کچھ حقیقت ہے اُن کا حُسن جمالؔ!

کچھ ہے پروردۂ تخیّل بھی

○

عشق کی آبرُو ترے دم سے — تجھ میں یہ دلکشی، مگر ہم سے

شعلۂ رُخ پہ یہ حیا کی پھُوار — پھُول پہنیا گیا ہے شبنم سے

کچھ امیدیں ہیں وہ بھی یاس انگیز — کچھ اُجالے ہیں وہ بھی مدّھم سے

کیا ودیعت ہُوا تھا روزِ ازل — کیا رہا، کیا چلا گیا ہم سے

صبحِ اُمّید واہمہ ہے جمال!

رستگاری کہاں شبِ غم سے

سنہ ۱۹۶۸ء، کراچی

○

آئنہ سامنے آجائے تو ہُو کر دیں گے

"مَیں" کو ہم اتنا مٹائیں گے کہ "تُو" کر دیں گے

رُوح کو قیدِ علائق کا کچھ احساس تو ہو

ایک ہی سانس میں اس جسم کو چھُو کر دیں گے

○

بے خبر جب تک رہے انجام سے　　زندگی گزری بہت آرام سے
رُخ پہ جب دیکھی لٹک اُس زُلف کی　　صبح نے رشتہ ملایا شام سے
ایسے ہی بدمستیاں کرتے رہے　　یوُں بھرم رکھا ہے خالی جام سے
میں یہ سمجھا پھر کوئی ٹھوکر لگی　　ماندگی ٹکرا گئی تھی گام سے

جیسے اپنے بخت کا رشتہ جمال!
مِل گیا ہو گردشِ ایّام سے

سنہ ۱۹۶۴ء، لاہور

○

یہ سب فریبِ تماشا ہے ورنہ اے گُلرو!
بہار سے بھی کوئی ہمکنار ہوتا ہے

جبینِ عشق کے سجدوں کا کچھ قصور نہ تھا
دماغِ سنگ ہی شائستۂ شعور نہ تھا

○

جامِ شراب پر ہے گماں آفتاب کا
کیا عکس پڑ گیا ہے تمہارے شباب کا

خالِ رُخِ حبیب ہے جامِ جہاں نُما
نُقطے میں آ گیا ہے خُلاصہ کتاب کا

پژمُردہ پھُول دیکھ کے یاد آ گیا مجھے
گزرا ہُوا زمانہ کِسی کے شباب کا

مشتاقِ دید رہ نہ سکا اپنے ہوش میں
اِک تار ہِل گیا تھا کسی کی نقاب کا

اِس دَور میں کہ قحطِ وفا عام ہے جمال!
آشوبِ زندگی ہے نہ ملنا شراب کا

۱۹۶۷ء، لاہور

○

تڑق جائے گا دِل کا آبگینہ
بکھر جائے گی رات، آہستہ بولو

جو دل سے اُٹھ کے لبوں پر مچل نہیں سکتیں
وہ ناشنیدہ صدائیں سلام کہتی ہیں

○

بلبل کو رنگِ گُل پہ ہنوز اعتبار ہے
کتنی فریب خُوردہ فصلِ بہار ہے

کیا تیرے انتظار کا حاصل ہے انتظار
کیا تیرے انتظار کی حد انتظار ہے

ہر سُو رِدائے سبزہ و گُل ہے بچھی ہُوئی
صحنِ چمن پہ یُورشِ رنگِ بہار ہے

یہ وقت ہے کہ ساغر و مینا ہوں سامنے
ہاں آج پھر فضائے چمن سازگار ہے

ہر شے میں زندگی تھی کبھی موجزن جمال
ہر شے سے اب نمُودِ غمِ روزگار ہے

۱۹۴۱ء، دھلی

○

ریزۂ سنگ سے کہسار نکالے ہم نے
مُشتِ خاشاک سے گلزار نکالے ہم نے

نجد کے دشت میں گُونجے ہوئے سنّاٹوں سے
مصر کے کوچہ و بازار نکالے ہم نے

اگست ۱۹۶۹ء، لاہور

○

تیرے دیوانے ہیں، بس یُونہی صدا دیتے ہیں　　لوگ تو بات کا افسانہ بنا دیتے ہیں

ہائے وہ پھُول سے رُخسار کہاں سے لاؤں　　جو لبِ شوق کو گلزار بنا دیتے ہیں.

اُن کے کوچے کی ہَوا بھی دمِ عیسےٰ ہے مجھے　　اُن کی دیوار کے سائے بھی ضیا دیتے ہیں

جب کوئی عرضِ وفا کا نہیں ملتا پہلو　　ہم اُنہیں دُور سے اک پھُول دکھا دیتے ہیں

اپنے ہی دل کے شراروں سے لپٹتے ہیں جمالؔ!
جل کے پروانے بھلا شمع کو کیا دیتے ہیں

۱۹۶۷ء، لاہور

○

چاند کو چھُو کے آ گئے پَل میں　　فکر پھر بھی ہے جہل کے چھَل میں

اس زمانے میں ویت نام کی جنگ　　آدمی پھنس گیا ہے دَلدَل میں

ستمبر ۱۹۶۹ء، لاہور

○

نیازِ عشق نہیں، نازِ بندگی بھی نہیں — جبینِ شوق کے سجدوں میں کچھ کمی بھی نہیں
ابھی سے فکر ہے تسخیرِ کائنات کرے — ابھی بشر کو مجالِ خود آگہی بھی نہیں
تمہارے حُسن سے رونق ہے بزمِ ہستی کی — جو تم نہیں تو ستاروں میں روشنی بھی نہیں
گزرتے ہیں مرے آگے سے اجنبی بن کر — یہ دشمنی بھی نہیں ہے یہ دوستی بھی نہیں

جمالؔ! عرضِ تمنّا کا حشر دیکھ لیا
جو بات ہم نے کہی اُس نے وہ سُنی بھی نہیں

۱۹۶۵ء، لاہور

○

پلکیں جھپکی تھیں، ہم نہیں سوئے — آنکھ روئی تھی، ہم نہیں روئے

گزرا جو ایک لمحہ کسی ہم نفس کے ساتھ — محسوس یہ ہُوا کہ زمانہ گزر گیا

بیمارِ غم کا حال نہ پوچھو ادا کے ساتھ　　بہتر ہے اُس کو زہر پلا دو دوا کے ساتھ

کیا کیا شبِ فراق میں ٹُوٹیں قیامتیں　　روئے لپٹ لپٹ کے دلِ مُبتلا کے ساتھ

بارِ چمن بنیں گے نہ اے باغباں! کبھی　　ہم اپنا رُخ بدلتے رہیں گے ہوا کے ساتھ

موجِ خرامِ ناز کی شوخی کو دیکھ کر　　سجدے لپٹ گئے ہیں ترے نقشِ پا کے ساتھ

پہلو سے دل کو کیسے جُدا کر دُوں اے جمالؔ!
گُزری ہے ایک عمر اسی آشنا کے ساتھ

۱۹۶۵ء، لاہور

بیٹھے بیٹھے یہ کون یاد آیا　　ہو گئی تیز نبض کی رفتار

غُنچۂ نو رسیدۂ خُود را　　فرصتِ لمحۂ شگفتن دِہ

○

آسُودۂ طلب نہ ہُوئے زندگی میں ہم　　اللہ رے طریقِ محبّت کے پیچ و خم

کچھ اس طرح فراق سے گھبرا رہے ہیں ہم　　جیسے کسی کا ساتھ رہا ہو جنم جنم

اب انتہائے شوق کی وارفتگی نہ پوچھ　　منزل قریب ہے مگر اُٹھتے نہیں قدم

غم زندگی کے واسطے وجہ نشاط تھا　　اللہ پھر نصیب کرے زندگی کو غم

سینے کا داغ بن گئیں وہ صحبتیں جمالؔ!

تھا التفاتِ یار بھی منجُملۂ ستم

۱۹۴۵ء، دہلی

○

مری رُودادِ غم سے آپ کیوں پہلو بدلتے ہیں　　کہانی خود بخود کوئی نیا پہلو بدل لے گی

یہ نغمۂ حیات مُسلسل فریب ہے　　یہ ساری کائنات مُسلسل فریب ہے

○

سوزِ ہستی سے شرارِ آرزو پیدا کریں		اپنے ہی جلوے کو اپنی ذات میں دیکھا کریں
لاکھ کوشش سے ہو پیدا، اک تبسّم زیرِ لب		پھر مہینوں اُس تبسّم کا سبب سوچا کریں
اک نیا کعبہ بنائیں اور بنا کر توڑ دیں		پھر تمہارے سامنے آ کر تمہیں سجدا کریں
دشت بھی ہم کو نظر آتا ہے رشکِ صد چمن		ہائے اس رعنائیِ ذوقِ نظر کو کیا کریں

اک نمک پاشِ جراحت کی ضرورت ہے جمالؔ!
پھر متاعِ لذّتِ زخمِ جگر پیدا کریں

۱۹۶۶ء، لاہور

○

اس دُنیا کی ہر ٹھوکر میں تجھ کو پتھر مل جائیں گے		تیرے آگے شیش محل ہے دیوانے! تُو نے کیا سوچا

خموشی عشق کی تہذیب بن چکی ہے جمالؔ!		کہاں سے آئے زباں عرضِ مدّعا کے لیے

○

جب تمہیں پہلو نشیں پاتا ہے دل　　اور بھی بے چین ہو جاتا ہے دل

عشق کی محرومیوں کا کیا عِلاج　　اُن کو پا کر آپ کھو جاتا ہے دل

اُس کرم نا آشنا کو کیا خبر　　ٹوٹنے پر کیوں سکوں پاتا ہے دل

پھر کسی کی یاد نے تڑپا دِیا　　پھر کوئی کھینچے لیے جاتا ہے دل

یاد جب آتے ہیں بیتے دن جمالؔ !

درد کی تصویر بن جاتا ہے دل !

سنہ ۱۹۴۱ء، دھلی

○

کچھ کم نہ تھا سویدا ہنگامۂ غمِ دل　　جاگے ہوئے تھے شب کے، نیند آئی سو گئے ہم

آپ خود میرے تصور میں چلی آئی تھیں　　آپ سے ملنے کی کب میں نے تمنا کی تھی

○

یہ کِس دُھن میں مُغنّی گا رہا ہے — کہ دل میں درد گھُلتا جا رہا ہے

ترا رو رو کے مِلنا وقتِ رُخصت — بھُلاتا ہوں مگر یاد آ رہا ہے

مِرے دل میں ہے تیری یاد اب تک — زمانہ ہے کہ گزرا جا رہا ہے

ترا شاعر ترے غم کی بدولت — مجسّم شعر بنتا جا رہا ہے

سویداؔ عہدِ ماضی کا ترانہ

چمن سے دُور کوئی گا رہا ہے

۱۹۴۲ء، دہلی

○

دل اپنا اے سویداؔ ایسا دُکھا ہُوا ہے — تھی داستاں کسی کی بیتاب ہو گئے ہم

سادگی کِس کی ہے یہ بے ساختہ پن کِس کا ہے — سچ بتاؤ یہ مری جان! چلن کِس کا ہے

○

یُوں تصوّر میں ہے وہ حُسنِ تمام — خواب میں جیسے عشرتوں کا خرام
آج اپنے سے کر رہا ہُوں گریز — یہ محبّت کا کون سا ہے مقام؟
وہ بھی کچھ خوش نظر نہیں آتے — جن کو حاصل ہے تیرا قُربِ دوام
حُسن میں زندگی کی رعنائی — عشق میں زندگی کا کیفِ تمام

دل کی آوارگی جمالؔ! نہ پُوچھ
نہ کوئی رہگزر، نہ کوئی مقام

سنہ ۱۹۴۴ء، دھلی

○

وہ نیم باز آنکھیں
مے خانہ ساز آنکھیں
شعروں میں ڈھل رہی ہیں
شاعر نواز آنکھیں

سنہ ۱۹۴۸ء، دھلی

در بدر پھرتے رہے تیری قسم تیرے بغیر　　یوں خدائی خوار تھے دنیا میں ہم تیرے بغیر

جیسے اک ٹوٹی ہوئی دیوار پر کاہی کی تہ　　دل کے ویرانے سے یوں لپٹا ہے غم تیرے بغیر

کس کے دل پر ہاتھ رکھ کر سونپ دیں دل کی متاع　　کس کے سر کی آج ہم کھائیں قسم تیرے بغیر

جیسے ٹوٹی شاخ پر اُجڑا ہوا سا آشیاں　　کس قدر ویراں نظر آتے ہیں ہم تیرے بغیر

مدھ بھری آنکھوں کی اُس میں مستیاں بھرتا جمال!
نامکمل رہ گئی تصویرِ غم تیرے بغیر

سنہ ۱۹۶۵ء، لاہور

کانٹوں سے چمن سجا کے دیکھو
شبنم سے جگر جلا کے دیکھو
رگ رگ میں بھڑک رہے ہیں شعلے
میری طرح دِل لگا کے دیکھو

سنہ ۱۹۶۹ء، لاہور

○

حسین چہرے کی سادگی بھی ادا نہیں ہے تو اور کیا ہے
یہ نیچی نظروں میں کارفرما حیا نہیں ہے تو اور کیا ہے

جھکی جھکی فتنہ زا نگاہیں، یہ بہکی بہکی تری ادائیں
لبوں پہ یہ جانستاں تبسّم قضا نہیں ہے تو اور کیا ہے

یہ جلوۂ گُل، یہ موجۂ مُل، یہ دوشِ فطرت پہ رقصِ کاکُل
گُناہ زُہدِ نظر کی رنگیں سزا نہیں ہے تو اور کیا ہے

بساطِ گیتی اُلٹ گئی ہے، نظامِ عالم بکھر گیا ہے
یہ شیشۂ دل کے ٹُوٹنے کی صدا نہیں ہے تو اور کیا ہے

کِسی کی فرقت میں بہہ رہا ہے جمالؔ آنکھوں سے خُونِ دل کا
کوئی بتائے اِن آنسُوؤں میں وفا نہیں ہے تو اور کیا ہے

۱۹۴۸ء، دھلی

○

جب سے کوُچے میں ترے اپنا ٹھکانا نہ رہا
ہم کو ہر سایۂ دیوار بُرا لگتا ہے

ہم خرد کو خرد سمجھتے رہے
اس میں دیوانگی بھی شامل تھی

○

جلوے کو تیرے دیدۂ تر سے گریز ہے — جانِ نظر کو ذوقِ نظر سے گریز ہے

مجنوں کی خاک ہے پسِ محمل لگی ہوئی — لیلےٰ کو اب بھی گردِ سفر سے گریز ہے؟

دل کاوشِ مآلِ وفا سے ہے بے نیاز — اس مُبتدا کو اپنی خبر سے گریز ہے

بے سوز و سازِ عشق نہیں بندگی قبول — کعبے کو اب جبینِ بشر سے گریز ہے

کیسے چھٹے فراق کی یہ تیرگی جمال !

اِس رات کو نمودِ سحر سے گریز ہے

۱۹۶۵ء، لاہور

○

حصولِ جاہ ہے زنگارِ شیشۂ دل کا — جہاں میں جن کو خُدائی ملی خُدا نہ ملا

ظلمتوں میں بھی منور ہیں امیدوں کے چراغ — دل میں ٹوٹے ہوئے تاروں کی چمک باقی ہے

○

آسماں ہے درپئے آزار ہنس لے بول لے
عیش کی گھڑیاں ہیں بس دو چار ہنس لے بول لے

تیرے دم سے زندہ و رقصاں بہارِ زندگی
اے پری رُخسار، خوش گفتار! ہنس لے بول لے

فکر کی ناگن ترے اِدراک کو ڈس جائے گی
زندگی بیزار! خُود آزار! ہنس لے بول لے

پھر کہاں یہ رونقِ بزمِ طرب، یہ نائے و نوش
پھر کہاں یہ لذّتِ گفتار ہنس لے بول لے

سر پہ آپہنچی سویدا! شامِ غم کی تیرگی
بڑھ رہا ہے سایۂ دیوار ہنس لے بول لے

سنہ ۱۹۶۷ء، لاہور

○

دل کی خاطر غم سہتا ہُوں
ہنستا ہُوں اور خوش رہتا ہُوں

سر کو جُھکائے سوچنے والے!
مَر جائے گا! سچ کہتا ہُوں

○

داغِ جگر سہی جو وصالِ صنم نہ ہو
اے دوست! آبروئے محبت تو کم نہ ہو

چلنے سے پہلے سوچ لے، اے رہ نوردِ شوق!
اِس راہ میں کسی کا نشانِ قدم نہ ہو

راہِ وفا کے خَم مری تقدیر میں سہی
جی چاہتا ہے آپ کی زلفوں میں خَم نہ ہو

مُرجھائیں گُل تو کھِل اُٹھیں سینے کے سارے داغ
یارب! بہارِ دورِ خزاں میں بھی کم نہ ہو

اِس دَور میں کہ قحطِ مسرّت ہے اے جمال!
وہ دل کہاں سے لاؤں کہ جس دل میں غم نہ ہو

سنہ ۱۹۶۷ء، لاہور

○

ریگِ صحرا سے جُوئے آب نکال
یا دلِ شب سے آفتاب نکال

یا کسی دل نشیں دلیل کے ساتھ
ایک نقطے سے اک کتاب نکال

○

دُور منزل ہے، رہ گزر معدُوم
مبتدا بے خبر، خبر معلُوم

وصل کے بعد بھی قرار نہیں
دل کو کیا ہو گیا، خدا معلُوم

میری آغوش میں وہ جانِ حیات
دِل کی یہ آرزُو بہت معصُوم

حسن کے آگے عشق بے مایہ
برق کے سامنے شرر معدُوم

درد کی ابتدا قیامت ہے
درد کی انتہا کسے معلُوم

اے سویدا! یہ کیا ہُوا تجھ کو
اتنا خاموش، اس قدر مغمُوم

۱۹۶۴ء، لاھور

○

جس کی خوشبو میں ہے مسیحائی
ہم اُسی زُلف کے ہیں سودائی
جام کیا میکدہ چٹخنے لگا
اک قیامت تھی اُس کی انگڑائی
وائے حسرت، کہ آستاں نہ ملا
مرحبا! ذوقِ ناصیہ سائی
دل میں مچلی تھی اُن لبوں کی یاد
آسماں پر دھنک نکل آئی
ٹھیرئیے، ہاں مجھے خیال آیا
آپ سے تھی کبھی شناسائی
بات یہ فیصلہ طلب ہے جمالؔ!
ہم تماشا ہیں یا تماشائی؟

۱۹۶۵ء، مدائن

○

شمعِ غم! سوزِ تمنّا کی سحر یاد نہیں
سینۂ شب سے جو نکلا تھا شرر یاد نہیں

جذبۂ شوق کو رہبر کی تمنّا ہے فضول
کیسی منزل کہ مجھے راہ گزر یاد نہیں

آپ کی تابشِ رُخسار کو کیا یاد کروں؟
اس اندھیرے میں مجھے اپنی نظر یاد نہیں

اجنبی! مجھ کو شناسا سے نظر آتے ہو
راہ چلتے کہیں دیکھا ہے، مگر یاد نہیں

یہ تو معلوم ہے خاکم بدہن آپ نہ تھے
کس نے لُوٹا یہ مرے دل کا نگر، یاد نہیں

کشتیِ دل سرِ گرداب تو دیکھی تھی جمال!
پھر کہاں ختم ہُوا اپنا سفر، یاد نہیں

۱۹۶۱ء، لاہور

○

سوزِ دل یہ ہے تو پھر رات بسر کیا ہو گی
شمع جب شام سے بھڑکے گی، سحر کیا ہو گی

جِس کے نالے دلِ مایوس سے آگے نہ بڑھے
ایسے بیمار کی پھر اُن کو خبر کیا ہو گی

کوئی اُمّید کا جگنو، کوئی غم کا شعلہ
ورنہ اِس دامنِ ظُلمت میں سحر کیا ہو گی

ڈُوب ہی جائے گا اِک روز سفینہ اپنا
زندگی ایسے تلاطم میں بسر کیا ہو گی

روشنی پرتوِ خورشید ہے، خود کچھ بھی نہیں
جو تجھے ساتھ نہ لائے وہ سحر کیا ہو گی

کوئی بُنیاد تو ہے اُن کے تغافل کی جمال!
جو مری سمت اُٹھے گی، وہ نظر کیا ہو گی

سنۂ ۱۹۶۵ء، مدائن

○

مثلِ غبار اُڑتے پھرے ہم ترے بغیر
یہ ذوقِ جستجو کا ہے عالم ترے بغیر

کس کس کی رہنمائی کے کھاتے رہے فریب
کس کس کے ساتھ چلتے رہے ہم ترے بغیر

اپنی سمجھ میں آ نہ سکا یہ فسونِ عشق
تیرا وجود ہم سے ہے اور ہم ترے بغیر

کس کی شراب، کیسی صراحی، کہاں کا جام؟
سرمایۂ نشاط ہے برہم ترے بغیر

تنہا وجودِ شوق نہ تھا عینِ ذاتِ عشق
محسوس خود کو ہو نہ سکے ہم ترے بغیر

ناگن کی طرح ڈستا رہا ہے جمال کو
تاریکیِ فراق کا عالم ترے بغیر

سنہ ۱۹۶۵ء، مدائن

○

دشت میں طوفاں، چمن میں برق آتش بار ہے
زندگی، سچ پوچھیے تو، اک جہنّم زار ہے

نالۂ بلبل پہ یُوں اٹھتی ہے گلچیں کی نظر
جیسے اِس گلشن میں اب آزادیِ گفتار ہے

کونسی جھنکار ہے جو چھیڑ دے سازِ حیات
کونسا نغمہ ہے وہ جس کا رگِ جاں تار ہے

دل کے ویرانے میں اب رونق کہاں سے آئے گی
جیسے سوداگر ہیں ہم ویسا ہی یہ بازار ہے

زندگی کو جاوداں کرتی ہے مقصد کی لگن
ورنہ ہر انساں اِک گرتی ہوئی دیوار ہے

غور سے دیکھو تو یُوں محسوس ہوتا ہے جمالؔ!
نقشِ پائے یار خود اِک فتنۂ رفتار ہے

سنہ ۱۹۶۶ء، لاہور

خود سے بچے تو برق نگاہی میں آ گئے
گھر سے نکل کے اور تباہی میں آ گئے

سب خاکساریاں مرے دامن میں رہ گئیں
سارے غرورِ طرّۂ شاہی میں آ گئے

نکلی تھی اُس کے رُخ سے تجلّی کی اِک کرن
کتنے ہی آفتاب سیاہی میں آ گئے

درماندگانِ شوق کو ہمواریاں نصیب
سارے نشیبِ قسمتِ راہی میں آ گئے

بالا بلند تجھ کو کوئی مانتا نہ تھا
سروِ چمن تمام گواہی میں آ گئے

ان سے زمانہ آنکھ ملائے گا کیا جمالؔ!
جو حادثوں کی پُشت پناہی میں آ گئے

فروری ۱۹۶۸ء، لاہور

○

اوہام رُخ بدل کر افکار ہو گئے ہیں
جب سائے بڑھ گئے ہیں دیوار ہو گئے ہیں

گردِ رہِ سفر ہیں، یہ مہر و ماہ و انجم
ہم تیری جستجو میں رفتار ہو گئے ہیں

وہ جن کی نازکی پر پھولوں کو رشک آئے
جب مجھ سے کھنچ گئے ہیں تلوار ہو گئے ہیں

کِس سامری نے پھونکا تعمیرِ نو کا افسوں
گھر اس طرح گرے ہیں بازار ہو گئے ہیں

خُنکی سے تیرگی کی سب خون جم گیا ہے
زِنداں سے ہم نکل کر دیوار ہو گئے ہیں

دشواریاں تھیں جن کی ضربُ المثل سویدا!
رستے وہ چلتے چلتے ہموار ہو گئے ہیں

جون ۱۹۶۹ء، لاہور

○

نگاہِ ناز کا رشتہ جو دل کے گھاؤ سے ہے
یہ آب و رنگِ تمنّا اسی لگاؤ سے ہے

یہاں جو آئے پیے اور اپنی راہ لگے
شراب خانے کی رونق ہی چل چلاؤ سے ہے

حکیم اپنے ہی سائے کی ناپ تول میں غرق
فروغِ فکر، مگر عقل کے گراؤ سے ہے

وفا تو کیسی، بس اک پاسِ وضع کہہ لیجے
اور اتنی بات بھی میرے ہی رکھ رکھاؤ سے ہے

مرے نصیب سے وابستہ ہے بھنور کا وجود
حیاتِ موج و تلاطم بھی میری ناؤ سے ہے

جو شعلے اُس کے لبوں پر دہک رہے ہیں جمالؔ!
فضائے شوق میں گرمی اسی الاؤ سے ہے

ستمبر ۱۹۶۸ء، لندن

○

جو نم نہیں تو کوئی داغ ہی اُبھر آئے
اندھیری رات میں کچھ تو مجھے نظر آئے

فضائے شوق کو زندانِ آرزو پایا
جو دشتِ یاس میں آئے تو اپنے گھر آئے

نہ رہبری کی تمنّا، نہ گمرہی کا خطر
فریبِ جادۂ احساس سے گزر آئے

یہ احتیاط، کسی پر کھُلے نہ ذوقِ طلب
یہ انتظار، کسی طرح نامہ بر آئے

حصارِ شوق عبارت ہے دامنِ دل سے
ہم اپنے سائے سے آگے کہاں نظر آئے

بلائے فکر و نظر بن گئی دروں بینی
جمالؔ! جیسے کسی غار میں اُتر آئے

اپریل ۱۹۶۹ء، لاہور

○

مذاقِ سوزِ محبّت کسی کو کیا معلوم
یہ دو دلوں کی حرارت کسی کو کیا معلوم

تمہیں بھی عشق ہے، تم بھی کسی کو چاہتی ہو
مرے سوا، یہ حقیقت کسی کو کیا معلوم

ذرا سی بات بھی نشتر کا کام کرتی ہے
ہمارے دل کی نزاکت کسی کو کیا معلوم

وہ پہلی بار، اُسے دیکھ کر، مرے دل پر
گزر گئی جو قیامت، کسی کو کیا معلوم

ہمارے سانس کا رشتہ ہے تیری یاد کے ساتھ
یہ ارتباط، یہ نسبت، کسی کو کیا معلوم

"مَے دو سالہ و معشوق چار دہ سالہ" (حافظؒ)
سویدا! اپنی ضرورت کسی کو کیا معلوم

۱۹۴۰ء، دھلی

○

چھلک نہ جائیں کہیں جُستجُو کے پیمانے
تری تلاش میں نکلے ہیں تیرے دیوانے

ہم اپنا حال بھی اِس ڈر سے کہہ نہیں سکتے
حقیقتوں کو بنا دیں گے لوگ افسانے

بہت ذہین ہیں اربابِ مے کدہ، لیکن
مرے مذاق کو شاید نہ کوئی پہچانے

یہ اور بات کہ مجھ کو قرار آ نہ سکا
ترا خیال تو آیا تھا دل کو بہلانے

میں خود گرا ہُوں کئی بار اوجِ پرویں سے
مری زباں سے سنو عظمتوں کے افسانے

جمالؔ! تیرے وطن کا شعار دیکھ لیا
جنُوں کو بیچ رہے ہیں خرد کے دیوانے

سنہ ۱۹۶۱ء، لاہور

○

اہلِ جنوں کے دل میں جو آیا، وہی کیا
یہ لوگ آندھیوں میں جلاتے رہے دِیا

اے دوست! کیا سناؤں تجھے سرگزشتِ غم
میں خود یہ سوچتا ہوں مرے دل کو کیا ہُوا

اک بات تھی کہ مہر بلب کر گئی مجھے
اِک تیر تھا جو دل میں اُترتا چلا گیا

شوقِ جنوں اثر کی یہ وارفتگی تو دیکھ
منزل سے راہروکئی منزل نکل گیا

جاتا ہے کون جنّتِ نظّارہ چھوڑ کر
دیوانہ تھا جو آپ کی محفل سے اُٹھ گیا

یہ کس فریبِ شوق میں تم آ گئے جمال!
کیا سوچ کر یہ بارِ امانت اُٹھا لیا

سنہ ۱۹۵۹ء، لاہور

○

جب سے یہ دل ماہیِ بے آب ہے
سوزِ غم اِک گوہرِ نایاب ہے

جس کی پہنائی میں نغمے گُم ہوئے
اس تخیّل کی کوئی مضراب ہے؟

خوابِ ہستی اِک فریبِ آرزو
آرزو بیداریوں کا خواب ہے

ناگنیں ہی ناگنیں چاروں طرف
یہ گزشتہ عشرتوں کا خواب ہے

خوش نہ ہو اے دل! کنارِ بحر سے
اس کے آگے منزلِ گرداب ہے

کس طرح اب نیند آئے گی جمالؔ!
آنکھ میں عکسِ رُخِ مہتاب ہے

۱۹۶۴ء، لاہور

○

ابھی تلاش، سرِ رہگزار باقی ہے
گزر چکے ہیں مسافر، غبار باقی ہے

یہ دل کے زخم جو ناسُور بنتے جاتے ہیں
تری نگاہ پہ کچھ اعتبار باقی ہے

اُلجھ رہا ہے کچھ اس طرح مجھ سے دستِ جنوں
کہ جیسے میرے گریباں میں تار باقی ہے

وفورِ شوق ہے یا بے خودیِ ذوقِ نظر
وہ آ گئے ہیں مگر انتظار باقی ہے

غمِ فراق سے دامن بچا رہے ہو جمالؔ!
ابھی تو کشمکشِ روزگار باقی ہے

سنہ ۱۹۵۴ء، لاہور

○

ہوئی ہے عشق کو قسمت بلندیِ پرواز
نصیبِ عقل ہیں اندیشہ ہائے دُور و دراز

کِسی کے ہاتھ میں آتے ہی جام یُوں چھلکا
سما گیا مرے سینے میں کائنات کا راز

جِلَو میں کتنے ہی میخانے لے کے آیا ہے
تمہاری نیم نگاہی کا مدھ بھرا انداز

ہمارے شوق نے جب تجھ کو ڈھونڈنا چاہا
قدم قدم پہ اُبھرنے لگے نشیب و فراز

جمالؔ! دل کو مرے کچھ نہ اعتبار آیا
ہزار باتیں بناتا رہا وہ حیلہ ساز

سنہ ۱۹۶۶ء، لاہور

○

زہرِ غم مل تو گیا اور تمنّا کیا ہے
جانِ شیریں! تری ہمّت کا تقاضا کیا ہے

کوئی محرومِ نظارہ ہے کوئی وصل سے شاد
کچھ تو معلوم ہو آخر یہ تماشا کیا ہے

میری تقدیر میں کانٹوں کے سوا کچھ بھی نہیں
میرے دامن سے بھلا پھولوں کا رشتا کیا ہے

غالباً پھر کسی امّید نے دم توڑ دیا
دل کے ہر گوشے میں یہ شورِ تمنّا کیا ہے

ذوقِ نظارہ بجا، یہ بھی سمجھتے ہو جمالؔ!
جلوہ کیا چیز ہے اور دیدۂ بینا کیا ہے؟

۱۹۶۵ء، مدائن

○

چاندنی رات کا اِس دَور میں امکان کہاں
لو، وہ بل کھا کے اٹھا سینۂ ظلمت سے دُھواں

ان غزالوں کو محبّت کی ادا کیا معلوم
ان کی آنکھوں میں بھلا شیوۂ تسلیم کہاں

کس کو معلوم تھا یہ خانہ خرابی ہو گی
ذوقِ نظّارہ سے مقصود نہ تھا دل کا زیاں

جس کے سائے میں کڑی دھوپ گزاری تھی کبھی
آج اُس باغ کا ملتا نہیں ڈھونڈے سے نشاں

دل کا کیا حال بنائے ہوئے بیٹھے ہو جمالؔ!
جیسے ٹوٹے ہوئے ساغر پہ لکیروں کے نشاں

۱۹۶۶ء، لاہور

○

ولولے وصل کے جب دل سے نکل جائیں گے
اشکِ غم خُونِ تمنّا سے بدل جائیں گے

جانے کب عقدۂ اُمّیدِ وفا حل ہوگا
جانے کب آپ کی زلفوں سے یہ بل جائیں گے

اِذنِ رفتار تو دے پائے طلب کو غمِ عشق
اپنی منزل سے بھی ہم دُور نکل جائیں گے

حُسن کی چشمِ فسوں گر کا اشارہ تو ملے
عشق کے سارے مقامات بدل جائیں گے

ہم نہ چھوڑیں گے کبھی دامنِ امّید جمالؔ!
پھُول کے شوق میں کانٹوں سے بہل جائیں گے

سنہ ۱۹۶۲ء، لاہور

○

دل کے آئینے میں یہ میرا ہی پیکر تو نہیں
میرا پیکر ترے انوار کا مظہر تو نہیں

کیوں مجھے راہ دکھاتے ہو صنم خانے کی
میری وحشت کا صلہ پھول ہیں، پتھّر تو نہیں

وسعتِ کون و مکاں تنگ نظر آتی ہے
آئنہ یہ بھی مرے قد کے برابر تو نہیں

ریگ زاروں میں نظر آتی ہے جو موجِ سراب
اس کے سینے میں نہاں چشمۂ کوثر تو نہیں

نوکِ ہر خار ہے فردوس در آغوشِ جمال!
کوئی گلزار مرے دشت سے بہتر تو نہیں

۱۹۶۹ء، لاہور

○

موجِ نکہت دلِ سوزاں میں کہاں سے آئے

روشنی گوشۂ زنداں میں کہاں سے آئے

عشق و ایثار کو کیا جانیں غرض کے بندے

بُوئے گُل خارِ بیاباں میں کہاں سے آئے

جو ترے رُخ کی صباحت سے جِلا پاتی ہے

وہ سحر چاکِ گریباں میں کہاں سے آئے

شمع دم توڑ چکی نورِ سحر کی خاطر

سوز اب سازِ بہاراں میں کہاں سے آئے

جلوۂ یار کی اُمّید میں بیٹھے ہو جمالؔ!

وہ بھلا دیدۂ حیراں میں کہاں سے آئے

۱۹۶۶ء، لاہور

○

میرے چہرے سے عیاں ہے مرے گھر کی صورت
دل کا سب حال بتاتی ہے بشر کی صورت

اے صبا! کِس کے لیے فصلِ بہاراں کی نوید؟
اب کسے یاد رہی ہے گُلِ تر کی صورت؟

میری راتوں کو نہ دے چاند ستاروں کا فریب
میری قسمت میں کہاں نورِ سحر کی صورت

میری تقدیر میں گردش کے سوا کچھ بھی نہیں
میری منزل بھی ہے یک گونہ سفر کی صورت

ہو کے آزُردہ تری بزم سے اُٹھّا تھا جمالؔ!
پھر نہ دیکھی کبھی اُس فردِ بشر کی صورت

۱۹۶۷ء، لاہور

○

اے تُرکِ شوخ گام! ذرا مُسکرا کے چل
یعنی قدم قدم پہ قیامت اُٹھا کے چل

تیری تو ہر ادا ہے قیامت سے ہم کنار
گردن جُھکا کے چل کہ نگاہیں مِلا کے چل

زُلفوں کے پیچ و خم میں اُلجھنے سے فائدہ
گر ہو سکے تو خُود سے بھی دامن بچا کے چل

اے راہ گیر! دُوریِ منزل کی فکر چھوڑ
ماضی کو حال، حال کو ماضی بنا کے چل

سرمستیِ نشاطِ وفا کے لیے جمالؔ!
ہر سنگِ رہ کو دوشِ خُودی پر اُٹھا کے چل

سنہ ۱۹۴۱ء دھلی

○

مستانہ وار ابر اُٹھا اور چھا گیا
اِک نو بہارِ ناز مجھے یاد آ گیا

شاید قریب تر ہُوں تری جلوہ گاہ سے
دُھندلا سا اِک غبارِ سرِ راہ چھا گیا

اب وجہِ اضطراب نہیں تیری بے رُخی
خوش ہُوں کہ وہ زمانۂ حرص و ہَوا گیا

کچھ بھُول سی گئی تھی جبیں آستانِ ناز
ٹھوکر لگی تو آپ کا دَر یاد آ گیا

لطفِ نگاہ و لذّتِ احساس کے بغیر
یہ کون تھا جمال! جو دِل میں سما گیا

۱۹۴۲ء، دہلی

بہت ممکن ہے، یُوں بھی وصل کا پہلو نکل آئے
میں اپنے دل کو ڈھونڈوں اور مُجھ میں تُو نکل آئے

کبھی آنسو بہانے کی تمنّا دل میں رہتی تھی
اور اب سعیِ تبسّم پر مرے آنسو نکل آئے

جسے پھُولوں نے صدیوں پیشتر خود میں بسایا تھا
اگر اِن ریت کے ذرّوں میں وہ خوشبو نکل آئے؟

ہجومِ یاس، آشوبِ تمنّا، منظرِ ظلمت
غمِ دل کے لیے عشرت کے کچھ پہلو نکل آئے

وہی لیلےٰ صفت راتیں سویدا! لَوٹ آئیں گی
اگر ان مست آنکھوں میں کوئی جادُو نکل آئے

سنہ ۱۹۶۴ء، لاہور

○

گماں کی دُھند میں گُم ہو گیا ہے میرا یقیں
علاجِ وہمِ حقیقت کسی کے پاس نہیں

ہمارے حال پہ اب اور کیا کرم ہو گا؟
فلک کے ناز اُٹھائے ہوئے ہیں خاک نشیں

ہجومِ تشنہ لباں ، کج ادائیِ ساقی
یہ آرزو کا کرشمہ ہے اور کچھ بھی نہیں

اگر میں دُور سے بھی اپنا سر جُھکا دوں گا
تمہارے در پہ اُبھر آئے گا نشانِ جبیں

اگر نشاطِ قدم عینِ جستجو ہے جمال!
ملے گی منزلِ مقصود بھی کہیں نہ کہیں

سنہ ۱۹۶۵ء ، مدائن

○

دامنِ گُل میں نہفتہ خرمنِ خاشاک ہے

دیکھ کر رنگِ چمن چشمِ خرد نمناک ہے

سر جُھکائے سوچتے رہنے سے کچھ حاصل نہیں

اے دلِ محزوں ترا انجام عبرتناک ہے

حُسنِ خود بیں آج تک اس راز کو سمجھا نہیں

آئنہ بھی دل زدوں کا دیدۂ نمناک ہے

میری آنکھوں میں سما کر بن گئی رنگِ جنوں

آپ کے رُخسار کی سُرخی بڑی چالاک ہے

شوق ہی اُفتادگی میں کارفرما ہے جمالؔ!

پھول کے قدموں میں رہنا عشرتِ خاشاک ہے

ستمبر ۱۹۶۸ء، پیرس

○

میری نظر میں عکس جو تیری نظر کا تھا
مجھ کو اندھیری رات پہ دھوکا سحر کا تھا

بے اعتباریِ رہِ منزل کے باوجود
خوش اعتبار دل میں ارادہ سفر کا تھا

بربادیوں کے بعد بھی ہم نازِ عشق تھے
ہر دشت میں غبار ہمارے ہی گھر کا تھا

ساقی سمجھ رہا تھا جسے ساغرِ نشاط
دیکھا تو اس میں خون ہمارے جگر کا تھا

مجبوریاں وفا کا مقدّر سہی جمال!
اُن کو تو اختیار قضا و قدر کا تھا

جنوری ۱۹۶۹ء، لاہور

○

جمالِ یار حدودِ نظر میں آ نہ سکا
مرا خیال ستاروں سے دُور جا نہ سکا
شبِ فراق کی تاریکیاں قیامت تھیں
جنہیں تمہارا تصوّر بھی جگمگا نہ سکا
ہے یادگار مری کوششوں کی بربادی
پھر اس کے بعد کوئی آشیاں بنا نہ سکا
جبینِ شوق سے آدابِ بندگی بھی گئے
نیازِ عشق میں نازِ جنوں سما نہ سکا
جمالؔ! شعلۂ غم کو ترے زوال نہیں
یہ وہ چراغ ہے جس کو کوئی بجھا نہ سکا

سنہ ۱۹۶۵ء، سوات

○

عظمتِ عقل کے معیار کی قیمت کیا ہے
اے ارسطو! ترے افکار کی قیمت کیا ہے
میں کسی قصرِ صدارت کا طلب گار نہیں
یعنی گرتی ہوئی دیوار کی قیمت کیا ہے
تیر کی طرح کھٹکتی ہے ہمیشہ دل میں
بات کے سامنے تلوار کی قیمت کیا ہے
میرے تپتے ہوئے صحرائے جنوں کے آگے
آپ کے سایۂ دیوار کی قیمت کیا ہے
جس کی تابش سے ملا نقشِ سویدا کو فروغ
اُس دمکتے ہوئے رُخسار کی قیمت کیا ہے

○

کب ہو آراستہ یہ کعبۂ جاں کیا معلوم
کون سے سنگ میں وہ بُت ہے نہاں کیا معلوم

ماندگی ایک قیامت ہے مسافر کے لیے
کب ہٹے راہ سے یہ سنگِ گراں کیا معلوم

آج ہم تم ہیں بہم، کل کی خبر کس کو ہے؛
وقت کی آندھیاں لے جائیں کہاں کیا معلوم

رنگ و نکہت پہ مٹی جاتی ہے یہ بلبلِ زار
رنگ و نکہت میں جو شعلے ہیں نہاں کیا معلوم

زندگی کوس ہی گنتے ہوئے گزرے گی جمال!
راہ کے طول کو منزل کا نشاں کیا معلوم

سنہ ۱۹۷۰ء، لاہور

○

(بہ قیدِ یک قافیہ)

فصلِ گُل کے لئے سودائے طلب جوش میں ہے
زندگی عشقِ جنوں خیز کی آغوش میں ہے

جس کو رہتی ہے سدا آپ کے دامن کی تلاش
قلزمِ عشق اُسی قطرے کی آغوش میں ہے

راہ کوئی بھی ہو دشوار تو ہوتی ہے ضرور
شوق کہتا ہے کہ منزل مری آغوش میں ہے

سوز کی دھیمی تپش شمع کے شعلے میں کہاں
یہ وہ دولت ہے جو پروانے کی آغوش میں ہے

دل میں یُوں وصل کے ارمان مچلتے ہیں جمالؔ!
جیسے وہ جانِ تمنا مری آغوش میں ہے

۱۹۶۵ء، مدائن

جگرِ پارہ پارہ

ہر گُلِ تر کو اپنے خون سے سینچ　　شاخِ گُل ہے تو آشیانہ ہے

صورتِ نوعیہ بدلتی ہے　　کوئی ذرّہ فنا نہیں ہوتا

وارفتگیِ شوق عجب گُل کھِلا گئی　　منزل ہمارے ساتھ تھی اور ہم سفر میں تھے

جو ہے وہ کہہ رہا ہے ترا رنگ زرد ہے　　اس کی خبر کسے جو مرے دل میں درد ہے

کیسے بچے کہاں سے بچے کشتیِ حیات　　طوفاں رُکا تو صورتِ گرداب بن گئی

سُورج کی اِک کرن سے تڑخ جائے کائنات　　شیشے کا ہو مزاج اگر سنگ و خشت میں

گلوں کی چاہ مجھے اس چمن میں لائی تھی　　خبر نہ تھی کہ یہ کانٹے مرا مقدّر ہیں

دل پری چہروں کا کاشانہ نظر آتا ہے　　یہ وہ کعبہ ہے کہ بُت خانہ نظر آتا ہے

جس دَور میں بھی دار کا قصّہ رقم ہُوا ۔۔۔ تر شیں یہ اُنگلیاں، کبھی یہ سَر قلم ہُوا

چاند کی بات نہ کر اوجِ ثریّا کو نہ دیکھ ۔۔۔ سر جُھکا اور نہاں خانۂ ہستی میں اُتر

کیا کہوں غم کی شعلہ سامانی ۔۔۔ دِل میں اِک باغ ہے چناروں کا
جلوہ فرما ہے اک قمر طلعت ۔۔۔ تاج پہنے ہُوئے ستاروں کا

حاصلِ بندگی نہ بن جائیں ۔۔۔ ٹھوکریں تیرے آستانے کی
پھیلتی جارہی ہیں گُلشن میں ۔۔۔ تیلیاں میرے آشیانے کی

ہر آن کلیجہ کٹتا ہے ۔۔۔ ہر سانس میں ہے تلوار کا دم

جب تک سوادِ دل سے کوئی کرن نہ پُھوٹے ۔۔۔ اس تیرگی کی حدِّ فاصل کہاں سے لاؤں

فِراق

تم نہ آؤ گے تو ٹوٹے گی قیامت مجھ پر ۔۔۔ آگ برسائے گا غم برقِ تپاں کی مانند
بُوئے گُل زہر سا گھولے گی مشامِ جاں میں ۔۔۔ سانس بن جائے گا اک تیغِ رواں کی مانند

لاہور، نومبر ۱۹۷۰ء

نظمیں

تمنّا

آج رہ جاؤ نا ، اب کہاں جاؤ گی؟

کیسی تاریک تھی یہ مری جھونپڑی جیسے صدیوں کی ظلمت ہو سمٹی ہوئی
تم جو آئیں برسنے لگی روشنی کاش یہ روشنی اب نہ جائے کبھی

آج رہ جاؤ نا ، اب کہاں جاؤ گی؟

ارتباطِ محبّت بڑی چیز ہے زندگی میں مسرّت بڑی چیز ہے
دو دلوں کی حرارت بڑی چیز ہے وقت کی یہ رفاقت بڑی چیز ہے

آج رہ جاؤ نا ، اب کہاں جاؤ گی؟

ہر گھڑی وقت کی گرد میں کھو گئی پھر نہ آئی پلٹ کر ، گئی سو گئی
روشنی تھک کے سائے تلے سو گئی سائے آگے بڑھے اور شب ہو گئی

آج رہ جاؤنا، اب کہاں جاؤ گی ؛

ہر طرف خیمہ زن رات کی خامشی　　ملگجی ملگجی چاند کی روشنی
دل یہ کہتا ہے باہر نہ نکلو ابھی　　لَے نہ ٹوٹے کہیں وقت کے ساز کی

آج رہ جاؤنا، اب کہاں جاؤ گی ؛

شپرّوں کی اُڑانیں، اندھیرا سماں　　ہر شجر جیسے دُھنکی ہوئی بدلیاں
راستوں پر رواں تیرگی کا دُھواں　　تیرگی میں نہاں خوف کے آسماں

آج رہ جاؤنا، اب کہاں جاؤ گی ؛

رات کی یہ فضا بھی مزے دار ہے　　جھینگروں کی صدا بھی مزے دار ہے
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا بھی مزے دار ہے　　وقت کا اقتضا بھی مزے دار ہے

آج رہ جاؤنا، اب کہاں جاؤ گی ؛

سنہ ۱۹۶۵ء، لاہور

○

کوئی سُنتا نہیں زمانے میں　　داستاں تیرے غم کے ماروں کی

گُلاب

کِھلے ہُوئے ہیں چمن میں یہ سُرخ سُرخ گُلاب
چھلک کے جم گئی ہو جیسے احمریں مئے ناب

وہ خوش نُمائی کہ باغِ عدن بھی رشک کرے
مہک وہ پائی کہ بُوئے ختن بھی رشک کرے

شفق کا رنگ سمیٹا ہے کِس قرینے سے
مثال ہے تری یاقُوت کے نگینے سے

چمن میں دیکھا ہے، کوہ و دمن میں دیکھا ہے
اِسے حسینوں کی ہر انجُمن میں دیکھا ہے

اِسی کے دم سے ہے تزئینِ خسروانِ بہار
اِسی کی خوشبُو پہ چلتا ہے کاروانِ بہار

اِسی گلاب سے ہوتا ہے بے کلی کا علاج
اِسی کے کیف سے پاتا ہے اعتدال، مزاج

اِسی گُلاب میں آدم کے سانس کی نکہت
اِسی گُلاب میں حوّا کے لمس کی لذّت

نہ جانے کتنے زمانوں کی جُون ہے اِس میں
نہ جانے کتنے شہیدوں کا خُون ہے اِس میں

نہ جانے کتنی ہی زلفیں گُلاب کا مسکن
نہ جانے کتنے ہی بسترِ گُلاب کا مدفن
کسی کے ہاتھ میں پہنچا تو بن گیا گلشن
کسی کے حُسنِ دل آرا کی ہو گیا چلمن
کسی کلائی پہ مہکا، کسی قبا پہ لگا
کسی کی گردنِ مینا صفت کو چُوم لیا

نگاہِ شوق ہے محمود اور ایاز گُلاب
جمال! حُسنِ حقیقی کا ہے مجاز گُلاب

۱۹۶۴ء، لاھور

○

سُرمئی رنگ کی خاموش فضاؤں میں جمال!
دل کی دھڑکن کے سِوا کوئی بھی آواز نہ ہو
درد ٹپکے مری آنکھوں سے نہ آنسو بن کر
میری صورت بھی مرے حال کی غمّاز نہ ہو

۱۹۶۵ء، کالام (سوات)

گُلِ داؤدی

خامۂ قُدرت کی ہے تحریر داؤدی کا پھُول

وحدۃ کی بن گیا تفسیر داؤدی کا پھُول

یا کسی غنچہ دہن کی گفتگو کا عکس ہے

یا کسی گُل پیرہن کے رنگ و بُو کا عکس ہے

یا کسی محبُوب کی دُھندلی سی اِک تصویر ہے

یا کسی شاعر کے رنگیں خواب کی تعبیر ہے

یا کسی مژگاں کے گُچھّے باغ میں بِکھرے ہُوئے

یا کسی کے بال شانے میں اُلجھ کر رہ گئے

یا فضاؤں سے دَھنک ڈھلکی، ڈھلک کر جم گئی

یا کرن سُورج سے نکلی اور نکل کر تھم گئی

سینکڑوں صدیوں سے یہ باغوں میں آتا ہے نظر

جانے کتنے روز و شب کی گردشوں کا ہے ثمر

باغ کو کرتا ہے یہ دورِ خزاں میں زرنگار

اِس میں شامل ہے سویدا یا تابشِ رُخسارِ یار

سمہ۱۹۶۴ء، لاہور

○

ٹیس جو کل تھی دل میں آج نہیں — میرے غم کا کوئی علاج نہیں

ہائے اُن آنسوؤں کی رنگینی — جن کو دامن کی احتیاج نہیں

لاکھ ظالم نے بے وفائی کی — پھر بھی ہے جان آشنائی کی

ہائے وہ طائرِ اسیرِ جمال! — جس نے کوشش نہ کی رہائی کی

باغِ عدَنؑ

مٹّی میں نہاں تھی گُلِ ہر رنگ کی صوَرت   ہر دانے میں سمٹی ہُوئی گلزار کی وسعت
ہر ذرّے میں آسُودہ تھی فردوس کی نزہت   ہر بیج نے محسُوس کی میووں کی حلاوت
ہر رنگ اُبلنے لگا مٹّی کے جگر سے
خاشاک سے اُٹھنے لگے سبزے کے ہیولے
بخشا گیا کلیوں کو چٹکنے کا سَلیقہ   غنچوں کو سکھایا گیا ہنسنے کا طریقہ
کانٹوں کو ملا گُل کی حفاظت کا وثیقہ   صد طوُر در آغوشں ہیں انوارِ حدیقہ
شاخوں کو مِلے بادِ بہاری کے جھکولے
خوشبو کو جھُلانے لگے پھُولوں کے ہنڈولے

پھُولوں سے جھلکنے لگا رنگین اُجالا — سُرخی سے دمکنے لگا مہتاب کا ہالا
پہنچی ہے کہاں شوخیٔ عکسِ رُخِ لالہ — گردُوں بھی ہے گویا مئے گلرنگ کا پیالا

ہر آنکھ میں سرشاریِ موسم کا اثر ہے
پھُولوں کی مہک موجۂ انفاسِ بشر ہے

چٹکی ہیں یہ کلیاں کہ بجے عیش کے مِردنگ — خاموش فضائیں ہیں کہ نغماتِ خوش آہنگ
شاخوں کی لچک ہے کہ نشاطِ مئے افرنگ — پھُولوں کی دمک ہے کہ فضاؤں میں گھُلے رنگ

منظر کو ہوئی دیدۂ حیراں کی ضرورت
موجوں کو ہے جیسے مہِ تاباں کی ضرورت

ضو افگن و ضوبار ہوئے حضرتِ آدم — صد جلوۂ خوش رنگ بنا گوشۂ عالم
یوُں دل کو لُبھاتی رہی گلکاریِ موسم — تنہائی کا عفریت ستانے لگا ہر دم

نس نس کو ڈھنکنے لگی بے رنگیِ خلوت
آدم کو ہُوئی پہلوئے حوّا کی ضرورت

اس تشنگیِ شوق کا ہر شے پہ اثر تھا — سرگشتہ سی پھرتی تھی رگِ تاک میں صہبا
تسکین کا سامان بالآخر بنی حوّا — آدم کو مِلا گوہرِ مقصودِ تمنّا

ہر شاخ بقربانِ طرب جھُوم رہی ہے
ایک ایک کلی شاخ کا مُنہ چُوم رہی ہے

ہنگامِ سحر وہ دلِ مضطر کی مناجات
معصوم نگاہوں کے وہ معصوم اشارات

وہ عشوے، وہ غمزے، وہ کنائے، وہ حکایات
وہ آدم و حوّا کے مچلتے ہُوئے جذبات

از شدّتِ جذبات ہمہ پاسِ حیا رفت
از تُندیِ انفاس سرِ بندِ قبا رفت

نورستہ و نوخیز یہ فطرت کی بہاریں
لب بستہ و لبریز یہ فطرت کی بہاریں

گُل کار و گُل انگیز یہ فطرت کی بہاریں
دل دوز و دل آویز یہ فطرت کی بہاریں

عشرت گہِ صد رنگ ہے نغموں کا چمن ہے
یہ باغِ عدن، باغِ عدن، باغِ عدن ہے

۱۹۶۶ء، لاہور

○

تودۂ ریگ پہ ایوان بنائے ہم نے
طاق و محراب جواہر سے سجائے ہم نے

خُود ہی بنیاد میں مرتے رہے پانی بن کر
اپنے کھینچے ہُوئے نقش آپ مٹائے ہم نے

دِلّی جو ایک شہر تھا

گُل کترتے ہُوئے مقراضِ خِرد کار سے ، ہم
علم کے گلشنِ بے خار سے گزرے تھے کبھی

اپنے پندار کی نازک سی صراحی لے کر
مستیِ چشمِ فسُوں کار سے گزرے تھے کبھی

گنگناتے ہوئے مومن کی غزل کا مطلع
نکہتِ گیسوئے شبیار سے گزرے تھے کبھی

اپنی قسمت کی سیاہی کو مٹانے کے لیے
تیری تابانیِ رُخسار سے گزرے تھے کبھی

اب تجھے دیکھنے آئے ہیں مُسافر بن کر
تیرے آغوش کی مہکار سے گزرے تھے کبھی

شہرِ دہلی! ہمیں پہچان کہ ہم دیوانے
تیرے ہر کوچہ و بازار سے گزرے تھے کبھی

اکتوبر ۱۹۶۱ء، لاہور

بیزاری

مشورہ دے کوئی اے مرے ہم نشیں!
اِس گلِستاں میں دل اپنا لگتا نہیں

اب نہ وہ عندلیبانِ بالانشیں　　اب نہ وہ لطفِ بادِ بہاری کہیں
سبزہ زاروں پہ پہلی سی رونق نہیں　　یہ وہی پھول ہیں، کیسے آئے یقیں

مشورہ دے کوئی اے مرے ہم نشیں!
اِس گلِستاں میں دل اپنا لگتا نہیں

باغباں گُل سے آنکھیں ملاتے نہیں　　گُل بھی خوشبو کو دل میں بساتے نہیں
پھول کانٹوں سے دامن بچاتے نہیں　　کانٹے دامن پکڑنے کو آتے نہیں

مشورہ دے کوئی اے مرے ہم نشیں!
اِس گُلِستاں میں دل اپنا لگتا نہیں

وہ چمن کی مہکتی فضا اب کہاں　　　بُلبُلوں سے چہکتی فضا اب کہاں
گُل کدوں کی مہکتی فضا اب کہاں　　　اب کہاں وہ بہکتی فضا اب کہاں

مشورہ دے کوئی اے مرے ہم نشیں!
اِس گُلِستاں میں دل اپنا لگتا نہیں

آندھیاں یوں اُٹھیں، ایسے جھکّڑ چلے　　　چھُپ گئی فصلِ گُل خشک پتّوں تلے
خوف سے سبزہ زاروں کے طوطے اُڑے　　　لگ گئے جا بجا ڈھیر خاشاک کے

مشورہ دے کوئی اے مرے ہم نشیں!
اِس گُلِستاں میں دل اپنا لگتا نہیں

یہ ہوا، جیسے برسات سہمی ہوئی　　　یہ فضا، جیسے تصویر سکرات کی
یہ نوا، درد و آلام کی بانسری　　　زِندگی جیتے جی مرثیہ بن گئی

مشورہ دے کوئی اے مرے ہم نشیں!
اِس گُلِستاں میں دل اپنا لگتا نہیں

شاخیں ٹوٹی ہوئیں پھول پامال سے ــــ قمریاں رہ گئیں مدھ بھری چال سے
وقت بیزار ہے اب مہ و سال سے ــــ حال بے حال ہے اپنے احوال سے

مشورہ دے کوئی اے مرے ہم نشیں!
اِس گُلِستاں میں دل اپنا لگتا نہیں

کرب کی کروٹیں، غم کا سیلِ رواں ــــ لڑکھڑانے لگیں ضبط کی بیڑیاں
دل سُلگنے لگا کٹ گئی جب زباں ــــ سانس کے ساتھ آنے لگا ہے دھواں

مشورہ دے کوئی اے مرے ہم نشیں!
اِس گُلِستاں میں دل اپنا لگتا نہیں

سازِ پُرسوز کے ایسے آرے چلے ــــ نغمے کٹ کٹ کے نالوں میں ضم ہو گئے
یہ جو دن آئے ہیں درد و آلام کے ــــ اِن کو نگلیں گے کب وقت کے اژدھے

مشورہ دے کوئی اے مرے ہم نشیں!
اِس گُلِستاں میں دل اپنا لگتا نہیں

سنہ ۱۹۶۵ء، لاھور

اے دوست

اتنے سرگشتہ و حیراں نہیں ہوتے، اے دوست!
اپنے سائے سے گُریزاں نہیں ہوتے، اے دوست!

اور کچھ ضبط و تحمّل کی ضرورت ہے ابھی
اس طرح چاک گریباں نہیں ہوتے، اے دوست!

کیفِ جذبات کا بھی پاس کیا جاتا ہے
دل کی لغزش پہ پشیماں نہیں ہوتے، اے دوست!

یہ تو معلوم ہے خود رفتۂ جذبات ہے تُو
پھر بھی اپنوں سے گُریزاں نہیں ہوتے، اے دوست!

عشق میں شیوۂ تسلیم ہے معیارِ وفا
اہلِ دل دست و گریباں نہیں ہوتے، اے دوست!

حُسن سے حُسن کا نظّارہ حسیں ہوتا ہے
آئنہ دیکھ کے حیراں نہیں ہوتے، اے دوست!

دل کے آنسو تو وہی ہیں کہ جو چھلکیں دل میں
اشکِ غم رونقِ داماں نہیں ہوتے، اے دوست!

۱۹۳۹ء، بمبئی

شاہ زادہ کامران کی بارہ دری

○

حال

ہے دیدۂ عبرت کے لیے ایک تماشا
کیا حال سُناؤں میں تمہیں بارہ دری کا

اب سرو و صنوبر کی جگہ خاک پڑی ہے
ہنستے ہُوئے غنچوں کی قبا چاک پڑی ہے

بوسیدہ سی دیواریں مکڑی کے یہ جالے
بِچھّو ہیں کہیں اور کہیں ناگ ہیں کالے

دن کو بھی یہاں شب کے دھندلکوں کا سماں ہے
جو شمعیں جلی تھیں کبھی یہ اُن کا دُھواں ہے

جھینگر کی صدا بن گئے ماضی کے ترانے
بے درد زمانے! ارے، بے درد زمانے!

ٹُوٹے ہوئے آثار کا اِک ڈھیر پڑا ہے
دُنیا کے حوادث سے بھلا کون بچا ہے

نشتر سا لگاتا ہے یہ ناظر کی نظر کو
اے گردشو! اِس ڈھیر کو بھی پیس کے رکھ دو

ماضی

چوتھی کی دُلہن، رشکِ چمن، بارہ دری تھی
موتی کی طرح دامنِ راوی پہ جڑی تھی

پھُولوں میں جھلکتی تھی سدا اس کی جوانی
سُنتے چلے آئے ہیں یہ راوی کی زبانی

تھے جنّتِ ہر قلب و نظر حسن کے شہکار
آتی تھی سدا کانوں میں پازیب کی جھنکار

جو شکل تھی وہ حُسن کی تصویر تھی گویا
یُوسف کے حسیں خواب کی تعبیر تھی گویا

ایسا کبھی ہوگا نہ ہُوا عیش کا منظر
ایسا کبھی دیکھا نہ سُنا عیش کا منظر

کچھ باندیاں چلمن سے لگی جھانک رہی تھیں
کچھ عیش کے دامن پہ گُہر ٹانک رہی تھیں

کوئی کسی پردے میں چُھپی ہانپ رہی تھی
انجانے کسی خوف سے کچھ کانپ رہی تھی

کوئی کسی شہزادے کے سینے سے لگی تھی
کوئی کسی جُھرمٹ میں کھڑی ناچ رہی تھی

آنکھوں سے جوانی کے شرر چُھوٹ رہے تھے
ہر سانس میں سو بندِ قبا ٹُوٹ رہے تھے

بکھرے تھے فضاؤں میں ہر اک رنگ کے آنچل
اُمڈے چلے آتے تھے گرجتے ہُوئے بادل

وہ ٹھنڈی ہوائیں، وہ جوانی کی بہاریں
وہ جھُولنے باغوں میں، وہ کوئل کی پُکاریں

وہ ساونی گاتے ہُوئے ہنس دینا کسی کا
وہ جھُولا جھلاتے ہوئے یہ کہنا کسی کا

"اُب شام ہوئی رین بسیرا یہیں ہوگا   جب تک ہے گھٹا، عیش کا ڈیرا یہیں ہوگا"

اب حُسن کی موجیں ہیں، نہ وہ نُور کا دریا   ہر سمت اندھیرا ہی اندھیرا ہے سویدا!

دن کو بھی یہاں شب کے دُھندلکوں کا سماں ہے

جو شمعیں جلی تھیں کبھی، یہ اُن کا دُھوُاں ہے

سنہ ۱۹۵۸ء، لاہور

○

کسی کے حُسن سے عالم سجائے جاتے ہیں

کسی کو خون کے آنسو رُلائے جاتے ہیں

کسی کی آہ لبوں تک پہنچ نہیں سکتی

کسی کے گیت زمانے میں گائے جاتے ہیں

سنہ ۱۹۵۸ء، دہلی

ہندی کی
غزلیں

بِرہا گیت

جیون جلتی آگ   جیسے دیپک راگ
بِرہن جنگل بیچ   ڈس لے کالے ناگ
رُت کی اُلٹی رِیت   ساون، برسے آگ
نیناں مُوند کے لیٹ   بھیتر بھیتر جاگ
سُونی سُونی سیج   مجھ بِرہن کے بھاگ

ساجن تیرا پیار   ندّی اُوپر جھاگ

○

ایک ہی ڈال کے دیکھ لے منوا! کھٹّے میٹھے آم
دھرتی ہی کے گربھ سے نکلے، راون ہو یا رام
شیام چرن کی رادھا داسی، گوکل متھرا داس
رادھا جیون کی پھلواری شیام ہے اُس کی باس

کامنا

○

گوری! تیرا گورا بدن — تو کس چندا کی چاندن
شاخوں جیسی تجھ میں لچک — پھولوں جیسی تجھ میں پھبن
رات کی رانی کی خوشبو — گورے پنڈے کی بھبکن
رادھا جیسے کومل گات — اُس پہ قیامت بھولا پن
ڈالوں تیرے مکھڑے پر — چاند ستاروں کی چلمن
گوندھوں تیرے جُوڑے میں — پھوٹے جب سورج کی کرن
پھر یہ پوچھوں چپکے سے — تجھ کو بناؤں کس کی دُلہن
تو یہ لجا کر مجھ سے کہے:
"میں کیا جانوں؟ میرے سجن!"

○

بِرہا آس

○

کوئی شیشہ، کوئی سنگ　　دُنیا والے رنگ برنگ

جلتا جائے جیون تیل　　پل پل ہوئے جینا تنگ

سُونی سُونی میری سیج　　گھر گھر باج رہا مِردنگ

سب سکھیوں کے ساجن ساتھ　　میں دیوانی کس کے سنگ

پھیکے پھیکے بگیا، پھُول!　　ساجن آئیں چھبکے رنگ

مجھ کو بھینچیں باجو بیچ　　ٹُوٹ رہا ہے برہن انگ

پھر میں چُپکے سے کہہ دُوں

میری تیری کیسی جنگ

سنہ ۱۹۶۴ء، لاہور

○

سب سکھیوں نے موج میں آ کے، ساون کا جب گیت سُنایا
مجھ پاپن کو آگ لگانے، ٹھنڈی باؤ کا جھونکا آیا
پریت کی گتھی سُلجھانے میں اور اُلجھ جائے گا مُورکھ!
سُندرتا اِک ڈھلتی چھایا، اوّل مایا، آخر مایا
من کے روگی، پریت کے بھوگی، آنکھیں مُوند کے سوچ لے جوگی!
اِس دھرتی پر آ کر تُو نے، جیون کا کیا کیا سُکھ پایا!
آشاؤں کے سُندر سپنے، مَن کو روگ لگا جاتے ہیں
جیسے پھُولوں کی شاخوں کا مرگھٹ پر پڑ جائے سایا
منہ سے کچھ تو بول سویدا! دِیوانے کیا سوچ رہا ہے
ہونٹوں کو یُوں سی لینے سے، پگلے! تیرے کیا ہاتھ آیا

۱۹٦٦ء، لاہور

○

تیرا جوبن درپن ، درپن
تیرے کنگن پریت کا بندھن
تیرے جھانجن ریت کا آنگن
تیری پائل چھوم چھنا چھن
تیری پلکیں کانٹوں کا بَن
تیری آنکھیں امرت منتھن
تیری زُلفیں سُورج انجن
تیرا مُکھڑا چندا درشن
تیرا پنڈا آگ کی لپکن
کِس دُلہا کی
تُو ہے دُلہن!

○

ساقی کی آنکھوں میں کاجل — مے خانے پر جیسے بادل
گھر کے آئی بدریا کاری[1] — ایسے میں چھنکا دو پایل
سر اپنا ہے، درد پرایا — کون گھِسے اب بیٹھ کے صندل
کانٹوں میں دونوں ہی اُلجھے — میرا دامن تیرا آنچل
ساحل پر طوفان کہاں ہے — مانجھی! اب منجدھار میں لے چل

آج مِلا تھا ہم کو سویدا
کھویا کھویا، پاگل پاگل

سنہ ۱۹۶۴ء، لاہور

○

[1] کالی

نیا تیری بیچ بھنور میں، ہمّت بھی تو ہار چکا ہے
ٹوٹا چپّو، بازو شل ہے، دیوانے تُو نے کیا سوچا

○

سُندر بن کی سُندر ناری — چھالا مارے گنگا جمنی

تیرا مُکھڑا، جیسے سُورج — میرا جیون، رین اندھیری

جیون جیون تجھکو ڈھونڈوں — دوارے دوارے، نگری نگری

اِس سنسار کی رِیت یہی ہے — جیسی کرنی ویسی بھرنی

سارنگی کے کومل سُر میں — کِس کی آشا چیخ رہی تھی

اُس کے گجرے تک جا پہنچی

باتِ سویدا : پھُولوں کی تھی

○

برکھا کی گھنگھور گھٹائیں گھِر گھِر کے تڑپاتی ہیں

بھُولی بِسری ساری باتیں دل کو یاد آجاتی ہیں

○

گوری کے پیروں کے جھانجن   کب باجیں گے میرے آنگن
برکھا کی رُت یوں بھی آئے   چھاجوں برسے آنگن آنگن
نس نس میں بھرتی ہے جوانی   بجلی کے کوندوں کی لپکن
بِرہن دیپک راگ کی ماری   جلتی آگ ہے بَیری ساون
گورے بِنڈے سے آتی ہے   جُوہی کے پھُولوں کی مہکن
اِس دنیا میں سب کچھ پایا   نا کوئی سجنی، نا کوئی ساجن
اُس کی زُلف سے بھاگ سویدا!
ڈس لیتی ہے کالی ناگن!

○

دِل کی بِپتا کیا پوچھو ہو
روگی ہے جیون جیون کا

○

تہمت مجھ دیوانے کے سر　　شورش تھی دیوار کے اندر

اس بستی میں رہنا ہوگا　　بیداری کو خواب بنا کر

تیرے نینوں کی شکتی سے　　رُک جاتا ہے بہتا ساگر

رُوپ کی رانی کھیت ہمارے　　رُوپ کا جادُو سب شہروں پر

محلوں کے آنگن میں رکھ دے　　ماجھی! یہ منجدھار اُٹھا کر

من میں ڈُوبنے والے پنچھی　　اُڑ جاتے ہیں جال کو لے کر

سنہ ۱۹۷۱ء، لاہور

○

بات ہماری غور سے سُن　　موتی جیسے بول ہیں چُن

دُوجے من کی کھوٹ نہ دیکھ　　اپنے من کے پاپ کو پُن

تاریخیں

تاریخ: کوٹھی "جہاں نما" ۵۵۔ایف ۔گلبرگ ۔لاہور

گوشِ مشتاق ازلبِ مہرِجہاں مژدہ شنید
قصرِ جنّت برزمیں از آسماں آمد پدید

۱۳۷۷ھ

○

تاریخِ آغازِ ترتیب و تدوین "نقشِ سویدا"

دل نشیں رہتا ہے خالِ رُخ جاناں کی طرح
نقش بر آب نہیں "نقشِ سویدا" ئے جمال

۱۳۸۵ھ

○

تاریخ: آغازِ شاعری و تکمیل وطباعت "نقشِ سویدا"

پہلے مصرعہ سے شاعری کے آغاز کا سن نکالا ہے دوسرے مصرعے میں "نقشِ سویدا" کی تکمیل وطباعت کی تاریخ ہے۔

بن گیا سوزِ محبت کے تسلسل سے جمال
۱۳۶۰ھ
نازشِ حسنِ وفا "نقشِ سویدا" کا نکھار
۱۳۹۱ھ

تاریخِ وفات والدِ بزرگوار مسیح الملک حکیم جمیل خاں وفا علیہ الرّحمۃ
خلف الرّشید مسیح الملک حافظ حکیم محمد اجمل خان علیہ الرحمۃ

برائے عنوان لوحِ مزار

اُفقِ حذاقت

١٣٩٠ھ

مندرجہ ذیل تاریخ پورے شعر سے نکالی ہے۔

مفکّر، محقّق، بصیر و عقیل طبیبِ یگانہ محمد جمیل

١٣٩٠ھ

تاریخ وفات حکیم حبیب احمد آشعر مرحوم خلف حکیم قاسم جان مرحوم
جو میرے بچپن کے ساتھی، بھائی اور شفیق اُستاد تھے۔

برائے لوحِ مزار

آشعرِ نکتہ داں، شعور افروز

١٩٧١ء

مندرجہ ذیل تاریخ کے پہلے مصرعے سے ولادت کا سن نکالا ہے اور دوسرے مصرعے میں سنِ وفات ہے۔

خاکِ آشعر بہ زمیں عالی وقار

١٩١٩ء

کاخِ آشعر بہ فلک نوری مقام

١٩٧١ء

تمت بالخیر